نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۵ ر تاریخ تک شایع ہوتا ہے
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ ر تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہیے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا
سالانہ قیمت پانچ روپیہ (ھہ) ششماہی تین روپیہ (سےمہ)
بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

شمارہ ۵	فہرست مضامین نومبر ۱۹۳۴ء	جلد ۲۶

ملاحظات ---------- ۲
ہماری عورتوں کا پردہ ---------- محمد اعظم خاں ام - اے ---------- ۹
بدمعاش ---------- سید محمد احسن بی - اے ---------- ۲۰
مکتوبات نیاز ---------- ۳۲
مصطفٰے کمال کی زندگی کے چند دلچسپ اوراق ---------- ۳۷
بیراگ کا بروگ ---------- ۴۹
سلاطین سلف ---------- ہوش بلگرامی ---------- ۵۶
فصاحت لکھنوی کی اصلاحیں ---------- ۶۰
سید محمد میر سوز ---------- ۶۷
منظومات ---------- اختر، سروپ رانی نگار، عدم ---------- ۷۹

نگار

اڈیٹر :— نیاز فتحپوری

جلد ۲۶	نومبر ۱۹۳۴ء	شمارہ ۵

ملاحظات

علم و یقین — اعتقاد و مذہب

آپ روز سورج کو طلوع کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، جتنا وہ افق سے بلند ہوتا جاتا ہے اس کی حرارت کو زیادہ محسوس کرتے جاتے ہیں، پھر آہستہ آہستہ وہ آپ کے سر سے گزرتا ہوا دوسری سمت کی طرف ڈھل جاتا ہے اور رفتہ رفتہ نگاہوں سے غائب ہو جاتا ہے — یہ کیا ہے ؟ — آپ اسے واقعہ کہتے ہیں — کیوں ؟ — اس لئے کہ آپ کا مشاہدہ ہے، آپ اپنے حواس کے ذریعہ ایسا محسوس کرتے ہیں اور متواتر و پے در پے اتنی مرتبہ محسوس کر چکے ہیں کہ اگر کوئی شخص آپ سے آکر یہ کہے کہ آج آفتاب نے طلوع نہیں کیا، یا یہ کہ طلوع کرنے کے بعد غروب نہیں ہوا تو آپ اسے جھوٹا کہدیں گے اور آپ باہر نکل کر اسکی تصدیق بھی نہیں کریں گے — انسان میں جو یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کا نام یقین ہے — اور یقین بھی ایسا جس کے لئے کسی برہان و دلیل کی حاجت نہیں —

انسان کی زندگی پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک سلسلہ ہے بے شمار "لمحاتِ احساس" کا یہاں تک کہ اگر آپ اُس کو "احساسِ مسلسل" کہدیں تو بیجا نہ ہوگا، لیکن "احساسِ محض" بیکار ہے اگر دنیا میں "محسوسات" کا وجود نہ ہو، اس لئے انسان فطرتاً مجبور ہے کہ وہ اپنے "ذوقِ احساس" کو پورا کرنے کے لئے محسوسات کا مطالعہ کرے، انسان فطرتاً سکون کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے، اور سکون نام ہے صرف "یقین" کا - ریب و شک، ایک بے چینی ہے، ایک اضطراب ہے اور انسان اس اُلجھن کے دور کرنے پر قدرت کی طرف سے مجبور ہے - اس لئے اگر اس کے "احساسات" مطمئن نہیں ہیں تو اسکے معنی یہ ہیں کہ وہ "سکونِ یقین" کی منزل سے ناآشنا ہے - اور "احساس" کا اطمینان اگر ہو سکتا ہے تو صرف محسوسات کی جستجو کے بعد کسی نتیجہ پر پہونچنے سے -

---

عام طور پر محسوسات کی دو قسمیں بتائی جاتی ہیں، ایک محسوساتِ خارجی، دوسرے محسوساتِ ذہنی یعنی ایک وہ جو خارج میں موجود ہیں جیسے درخت پتھر پانی وغیرہ اور دوسرے جن کا بظاہر وجود نہیں پایا جاتا لیکن ہم اسے محسوس کرتے ہیں، جیسے گرمی، سردی وغیرہ - مگر میرے نزدیک یہ تقسیم صحیح نہیں کیونکہ محسوسات جتنے بھی ہیں تمامتر خارجی ہیں اور جن کو "ذہنی" کہا جاتا ہے وہ بھی کسی نہ کسی واسطہ سے محسوساتِ خارجی ہی سے پیدا ہوتے ہیں - یقیناً گرمی سردی کوئی مادی محسوس چیز نہیں لیکن جن اسباب کے ماتحت گرمی یا سردی محسوس کیجاتی ہے وہ "خارجی" محسوسات سے باہر نہیں -- بیشک محبت و نفرت کا احساس بالکل ذہن سے متعلق ہے، لیکن کیا وہ چیز جس سے یہ جذبات متعلق ہیں خارج میں موجود نہیں؟ - مادہ اور اعراض دو علحدہ علحدہ چیزیں بتائی جاتی ہیں، درانحالیکہ عرض کا وجود مادہ سے کہیں علحدہ نہیں - پھول ہے تو رنگ بھی ہے، بو بھی ہے، وہ نہیں تو یہ بھی نہیں،

یقین کے کئی مراتب و مدارج ہیں - ہم دور سے دھواں اُٹھتا ہوا دیکھتے ہیں اور یقین کر لیتے ہیں کہ وہاں آگ کا وجود ہے، لیکن آگ کی نوعیت کیا ہے، اسکی خبر نہیں ہوتی، ہم چلکر وہاں جاتے ہیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ کسی نے خس و خاشاک جمع کر کے اس میں آگ لگادی ہے -- ہم وہاں سے واپس آتے ہیں، لوگ پوچھتے ہیں کہ آگ کیسی ہے، ہم بتا دیتے ہیں، وہ سُنکر مطمئن ہو جاتے ہیں، لیکن کیا ان کا یہ اطمینان اس درجۂ یقین کو پہونچ سکتا ہے جو ہمیں حاصل ہے - کیا یہ ممکن نہ تھا کہ ہم کہدیتے کسی نے لکڑی جلائی ہے اور وہ یقین کر لیتے -

ہمیں ایک گھڑا مٹی کا نظر آتا ہے، اس کی تازگی دیکھ کر سمجھ لیتے ہیں کہ اس میں پانی ہے، قریب جا کر پانی کو دیکھتے ہیں تو یقین ہو جاتا ہے، لیکن جب گلاس میں پانی لیکر پی لیتے ہیں تو یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ سرد ہے یا گرم -

غور کیجئے کہ یقین کے ان تمام مدارج میں "مطالعۂ محسوسات" کو کتنا دخل ہے - اگر خود اپنی سعی و کوشش سے کام لیکر خود اپنی عقل و احساس کو ذریعہ بنا کر کوئی علم حاصل کیا ہے تو وہ ایک "یقین ذاتی" ہے جسے کوئی قوت

متزلزل نہیں کر سکتی، لیکن اگر ہم نے صرف دوسروں کی زبانی سُنکر کسی بات کو باور کر لیا ہے تو وہ محض "یقین روایتی" ہے جس میں ریب و تزلزل کا زیادہ امکان ہے اور تصدیق قلب کا بہت کم۔

تصدیق کی یہ منزل، سکونِ نفس کا یہ مرتبہ از خود حاصل ہونے والی چیز نہیں، بلکہ پیدا ہوتا ہے۔ محسوسات و موجودات کے مطالعہ سے، پھر یہ مطالعہ جتنا غایر ہوگا، اتنا ہی بلند یہ مرتبہ ہوگا اور یہی وہ چیز ہے جس نے دنیا میں علوم و فنون کی بنیاد ڈالی اور انسان کے اقتدار کو تمام روئے گیتی پر قائم کر کے اسے خلافتِ الٰہی کی منزل سے روشناس کیا ——

آیئے ذرا مدارج خلافت پر بھی غور کر لیں۔

میں ایک وزنی گیند ہوا میں اُچھالتا ہوں، وہ فوراً نیچے آجاتی ہے۔ بار بار پھینکتا ہوں وہ بار بار زمین پر آکر گرتی ہے۔ میں یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ بھاری چیز کبھی اوپر نہیں ٹھہر سکتی۔ دوسرا شخص اس پر زیادہ غور کرتا ہے اور وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ وزن خود کوئی چیز نہیں ہے بلکہ نام ہے صرف کشش زمین کا۔ تیسرا ایک قدم اور آگے بڑھاتا ہے اور سوچتا ہے کہ زمین کی کشش کا مقابلہ کیونکر ہو سکتا ہے، یہاں تک کہ وہ غبارہ اور ہوائی جہاز بنا کر اس مقاومت میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ آج دنیا کا تمام ہنگامۂ ترقی اسی مطالعہ پر قائم ہے اور اسی یقین کی سرزمین سے ارتقاء کے چشمے پھوٹے ہیں۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ انسان کو خود اپنے ملک کی بھی خبر نہ تھی آج وہ نہ صرف کرۂ ارض بلکہ فضا میں تیرنے والے کروڑوں اور اربوں میل دور کے کروں کا حال معلوم کر چکا ہے۔ یہ سب کرشمے ہیں یقین کے جو نتیجہ ہے علم کا۔

ایک شخص سوال کرتا ہے کہ اس تمام جد و جہد سے فایدہ؟ جبکہ انسان کو بہر حال فنا ہونا ہے۔ سوال ممکن ہے صحیح ہو، لیکن استدلال غلط ہے۔ انسان انفرادی حیثیت سے فانی ہے، لیکن اجتماعی حیثیت سے اس کو بقا، دوام حاصل ہے۔ انسان کی موجودہ صورت بدل سکتی ہے، اسکے عادات و اطوار میں تغیر ہو سکتا ہے، اس کے افراد یقیناً فنا ہوتے جائیں گے، لیکن انسان بہر حال باقی رہیگا۔ کرۂ ارض پر نہ سہی، کسی اور کرہ میں —— انسان فطرت کی تخلیق کا مظہر آخریں ہے اور اگر آفرنیش کو فنا ہے تو انسان کو بھی ہے ورنہ نہیں۔ اس لئے انفرادی نقطۂ نظر سے جد و جہد پر گفتگو کرنا مقتضائے فطرت کے خلاف ہے، قدرت کی مرضی کے منافی ہے۔

آپ سمندر کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک نامتناہی سلسلہ ہے موجوں کا، درانحالیکہ ہر موج اپنی جگہ اُٹھکر فنا ہو جاتی ہے، پھر کیا سمندر کا وجود ان موجوں کے فنا ہونے سے ختم ہو جاتا ہے، جو موج اس لمحہ میں نمودار ہو کر فنا ہوئی ہے اسے پھر نہیں اُبھرنا، لیکن کیا اس سے سمندر کو کوئی نقصان پہونچ سکتا ہے۔ بالکل یہی حال عالم انسانی کا ہے کہ اس کے افراد مٹتے جاتے ہیں لیکن وہ علیٰ حالہٖ اپنی جگہ قایم ہے اور ہمیشہ قایم رہے گا۔

دُنیائے مذہب کے اصول مگر کچھ اور ہیں - وہاں علم و یقین کا نام اعتقاد ہے اور اسکی تعلیم "کل شئی حادث" (ہر چیز فنا ہونے والی ہے) کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے - مذہب کے نزدیک انسان نہایت حقیر، حد درجہ بے بس و بیکس اور مجبور و لاچار چیز ہے، اس کی کوئی حرکت اور اس کا کوئی خیال اس کے اختیار میں نہیں - جو چاہتا ہے خدا کرتا ہے اور جو چاہے گا کرے گا، انسان کا کام صرف سر عجز جھکا دینا ہے اور آنکھ بند کرکے، ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ کر دوسری دُنیا کے اس عمیق و تاریک غار کی طرف چلا جانا جس کا علم صرف اس قدر حاصل ہے کہ کچھ معلوم نہیں"-

مذہب کہتا ہے کہ انسان دُنیا میں صرف اس لئے آیا ہے کہ وہ عبادت کرے اور خدا کی پرستش میں رات دن مصروف رہے - لیکن اس سے پوچھئے کہ خدا کیا، اور اسکی پرستش کیوں؟ تو وہ کہتا ہے کہ خدا کی حقیقت پوشیدہ ہے، کسی کی قدرت نہیں کہ اس کو سمجھ سکے اور عبادت اس لئے کہ اس نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے اُس نے جس کا حال معلوم نہیں - الغرض مذہب کے تمام عقاید کا عنصر عظیم "عدم علم" ہے اور اسی نہ سمجھ سکنے، نہ جان سکنے کا نام وہاں یقین رکھا جاتا ہے -

---

پھر اگر یہ "عدم علم" کوئی مستقل تعلیم ہوتی، تو بھی ایک بات تھی، لیکن چونکہ انسان کی فطرت جستجو پسند ہے اور وہ اسوقت تک چین سے نہیں بیٹھتا جب تک اس کی یہ خلش دور نہ ہو، اس لئے مذہب اس پر بھی قایم نہ رہ سکا اور باوجود اس کے کہ وہ خود خدا کو نہیں سمجھ سکا تھا، لیکن لوگوں کو اس نے سمجھایا، باوصف اس کے کہ وہ دوسری دُنیا سے بیخبر تھا لیکن دوسروں کو اس سے آگاہ کیا - اور اس شان سے اس اعتماد و یقین کے ساتھ کہ یہ سب کچھ گویا حقایق ثابتہ میں شامل ہے اور محسوسات ظاہری سے متعلق -

چنانچہ وہی جس کی کُنہ حقیقت، کو وہ نہیں پا سکتا تھا دفعتہً خفا سے ظہور میں آجاتا ہے اور اس انداز سے کہ وہ کرسی پر بیٹھا ہوا ہے، چاروں طرف اس کے خدام (ملائکہ، مقربین) حضوری میں حاضر ہیں، وہ اپنے خاص خاص بندوں سے ہمکلام ہوتا ہے، جس سے خوش ہوتا ہے اس کو باغوں میں بھیجدیتا ہے، جس سے برہم ہوتا ہے اسکو آگ میں جھونک دیتا ہے، وہ سُنتا ہے لیکن کان نہیں رکھتا، وہ دیکھتا ہے مگر آنکھوں سے نہیں وہ بولتا ہے مگر زبان سے نہیں - الغرض وہ دنیا ہی کے بادشاہوں کی طرح ایک جلیل القدر بادشاہ ہے اور اس پر کوئی حکمراں نہیں وہ بے نیاز مطلق ہے، لیکن ہماری عبادتوں کی پرواہ ضرور کرتا ہے، وہ احتیاج سے بلند و ارفع ہے، لیکن ہمارے عجز و نیاز کی اس کو ضرورت ہے - وہ کسی چیز سے متاثر نہیں ہوتا لیکن نافرمانی سے اسکو غصہ یقیناً آتا ہے وہ بے انتہا رحم و کرم والا ہے مگر گناہگار کو بغیر آگ میں جھونکے مانتا نہیں -

وہ موجود ہے لیکن زمان و مکان سے بے نیاز ــ وہ ہر لمحہ میں قدیم ہے، لیکن لمحہ فنا ہو جاتا ہے اور وہ نہیں ــ وہ عادل ہے لیکن عدل کا پابند نہیں جس کو چاہے بخش دے اور جسے چاہے سزا دے ــ علم کہتا ہے کہ یہ اجتماع اضداد کیسا، مذہب کہتا ہے کہ خدا کی مرضی، علم کہتا ہے کہ یہ تمام باتیں کیونکر معلوم ہوئیں، مذہب کہتا ہے، خدا کے برگزیدہ بندوں کے کہنے سے ــ علم کہتا ہے کہ اس برگزیدگی کا علم کیونکر ہوا، جواب ملتا ہے کہ انھیں کے قول سے ــ علم سوال کرتا ہے کہ کیا انسان بغیر تحقیق کئے ہوئے محض دوسروں کے کہنے پر اپنے نفس کو مطمئن کر سکتا ہے، جواب دیا جاتا ہے "کیوں نہیں" ــ علم پوچھتا ہے کہ کیا یقین، اسی کا نام ہے، مذہب کہتا ہے "بیشک"

مذہب کی تعلیم ہے کہ یہ دنیا جس میں انسان زندگی بسر کرتا ہے، یعنی محسوسات کی یہ ٹھوس دنیا، بالکل عارضی چیز ہے اور محض ایک پرتو ہے اس دوسری دنیا کا جو ہمیشہ قائم رہنے والی چیز ہے ــ مگر وہ دوسری دنیا کیسی ہے؟ ــ اس میں بہشت ہے، دوزخ ہے، دیدار خداوندی ہے یا اس سے مہجوری ــ باغ و راغ ہیں، حور و قصور ہیں، فواکہ و اثمار ہیں دودھ اور شہد کی نہریں ہیں، کوئی فکر نہیں ہر وقت آزادی سے کھاؤ پیو اور وہ سب کچھ کرو جس سے اس دنیا میں باز رکھا جاتا ہے ــ یا پھر دہکتی ہوئی آگ کے غار ہیں، اژدہے ہیں، بچھو ہیں، خون و پیپ ہے، چیخ ہے، کراہ ہے ــ پوچھئے:-

کیا وہاں رقص و سرود بھی ہے ــــ کیوں نہیں درختوں پر چڑیاں چہچہا رہی ہوں گی ـ

کیا وہاں موٹر، ہوائی جہاز، ریل بھی ہے ــــ بیشک ہے، انسان نے کسی جگہ پہونچنے کا خیال کیا اور فوراً پہونچ گیا، یعنی

آنکھ کی بند ہوا کوچۂ جاناں پیدا

کیا وہاں "زہرۂ صبح و جام بلور" بھی میسر ہے ــ اس کا کیا ذکر کیونکہ وہاں تو ہر وقت صبح صادق ہی رہیگی اور جام بلور کیا معنی، وہاں تو دنیا کے قیمتی سے قیمتی جواہر سنگریزوں کی طرح بکھرے ہوئے نظر آئیں گے ــ بالکل درست لیکن پوچھئے کیا وہاں انسان کو کسی شے کے حصول کے لئے جد و جہد کرنا پڑے گی، کیا یہ دھڑکا لگا رہیگا کہ ممکن ہے فلاں چیز ہم کو نہ ملے یا ملنے کے بعد ہاتھ سے نکل جائے ــ اس کا جواب بالکل نفی میں ملیگا ــ پھر تماشہ یہ ہے کہ فطرت انسانی تو بدستور اس دنیا میں بھی یہی رہیگی، لیکن لذت و الم کا مفہوم بالکل بدل جائے گا ــ گویا ان کا وجود احساس انسانی اور اس کی فطرت سے علحدہ قایم ہے!

اب ذرا اور گہرائی کی طرف جائیے اور غور کیجئے کہ مرنے کے بعد انسان کا ایک زمانۂ غیر معلوم تک عالم برزخ میں رہنا اور پھر بال سے زیادہ باریک تلوار سے زیادہ تیز "پل صراط" پر چلکر دوزخ یا جنت تک پہونچ جانا کیا غایت رکھتا ہے ــ کہا جاتا ہے کہ مصلحت خداوندی ہر جگہ اور ہر بات میں کارفرما ہے ــ لیکن موت کے بعد انسان کا تمام تخت

ھ مراحل سے گزر کر عذاب یا ثواب کی دائمی زندگی بسر کرنا کس نتیجہ کے لئے ہے۔ بہشت و دوزخ سے کسی کو لوٹ کر پھر دنیا میں جاتا نہیں کہ وہاں کے لوگوں کو ان کے حالات معلوم کر کے تخویف یا ترغیب ہو۔ پھر خدا کی اس میں کیا مصلحت ہوسکتی ہے کہ وہ انسان کو زندگی دوام عطا کر کے بقا میں اپنا شریک تو بنا لیتا ہے، لیکن دنیا والوں کے لئے مایۂ عبرت و بصیرت بنانے کے لئے طیار نہیں۔

صدیاں گزر گئیں کہ مذہب کی یہ تعلیمات بدستور اسی طرح اپنے لغوی معنی کے لحاظ سے دنیا میں کارفرما رہیں، یہاں تک کہ علم نے بڑھکر اسکو چیلنج دیا۔ ظاہر ہے کہ مشاہدات کا جواب قیاسات سے اور "یقینیات" کا مقابلہ "ممکنات" سے نہیں ہوسکتا تھا، اس لئے ایک گروہ ایسا پیدا ہوا جس نے تلقینیات مذہب کے ظاہری معنی سے عدول کر کے انکا ایک باطنی مفہوم پیش کیا اور بتایا کہ یہ صرف تشبیہات و استعارات ہیں، لوگوں کو متاثر کرنے کیلئے خطیبانہ انداز بیان ہے، لیکن افسوس ہے کہ وہ مراسم و شعائر میں کوئی تبدیلی نہ پیدا کر سکا اور اس جواب کی حقیقت جان چھڑانے سے زیادہ اور کچھ نہ رہی علم کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ پیچھے مڑ کر دیکھتا، سیلاب کی طرح اٹھا اور درمیان کے تمام چٹانوں کو کاٹتا ہوا چلا گیا۔ جن چیزوں کو ساتھ دینا تھا وہ ساتھ چلی گئیں، جن کو یہ منظور نہ تھا وہ اپنے منتشر اجزا لئے ہوئے پیچھے رہ گئے۔ چنانچہ مذاہب عالم کا یہی حشر ہوا۔

مگر دنیا کے تمام مذاہب میں ایک مذہب ایسا تھا جو اس طوفان کا ساتھ دے سکتا تھا، علم کے اس سیلاب کا شناور بن سکتا تھا، لیکن اسکو دنیا فراموش کر چکی ہے، خود اس کے ماننے والے اسکی حقیقت سے بیخبر ہیں اور اگر کوئی انھیں یہ بھولا ہوا سبق یاد دلاتا ہے تو اُسے باغی سمجھ کر نکال دیتے ہیں — اس مذہب نے کبھی اس بات کی تلقین نہیں کی کہ تم بغیر سمجھے ہوئے لغو اعتقادات کا اتباع کرو بلکہ اس نے ہمیشہ اسی بات پر زور دیا کہ اپنی فکر و کوشش سے کام لو، غور و تدبر کرو، کائنات کا مطالعہ کر کے حقائق اشیاء کا علم حاصل کرو دنیا میں ہمیشہ آگے قدم بڑھاؤ اور ترقی کی اس چوٹی تک پہنچ جاؤ جہاں سے نیابت خداوندی کا اعلان کیا جاسکتا ہو اس نے یہ بھی بتایا کہ نیابت خداوندی کیا ہے، وہ انسان کی انتہائی کامیاب تمناؤں کی بہشت ہے، استعلاء و ترقی کی سکون بخش جنت ہے، کامرانیوں کی سلسبیل ہے، مسرتوں کی جوئبار ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھا دیا کہ اگر انسان نے یہ سب کچھ حاصل کرنے کی کوشش نہ کی، تو ذلت و نکبت کی آگ ہے، پستی و خسران کے دل جلا دینے والے شعلے ہیں، اور پامالی کی وہ تکلیفیں ہیں کہ سانپوں کی پھنکار اور بچھو کے نیش بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔

مگر ہے کوئی آج، جو صرف اس تعلیم کو اساس مذہب بنائے اور ہے کسی میں ہمت جو پوست کو علحدہ کر کے مغز پیش کرے — علم اپنا "یقین" کا پرچم لئے ہوئے آگے بڑھتا جا رہا ہے، کائنات کو فتح کر کے بہشتوں اور جنتوں کو اپنے لئے۔

مخصوص کرتا جا رہا ہے، نعائم ولذائذ کو سمیٹ سمیٹ کر دامن مراد بھر رہا ہے — لیکن مذہب ؟ — وہ بدستور اپنے ممکنات کے اوہام میں مبتلا ہے، قیاسات کی دلدل میں گرفتار ہے۔ اس نے منھ بہشت کی طرف کر لیا ہے اور کہہ رہا ہے منزل اِدھر ہے وہ سکون کا طلبگار ہے — وہ سکون جس میں موت کی سی غفلت ہو، پتھروں کا سا جمود ہو، وہ کہتا ہے کہ اس دنیا کی پامالی دوسری دنیا کا عروج ہے، یہاں کی ذلت وہاں کی عزت ہے — حالانکہ بتانے والے نے صاف صاف بتا دیا تھا کہ "ہل یہلک الا القوم الفاسقون" سے اسی دنیا کی ہلاکت مراد ہے اور فاسق وہی ہے جس نے اسی آب و گل کی دنیا میں جد و جہد ترک کر دیا۔

آج اکتوبر کی ۲۶ ہے اور میں کہ زیادہ سے زیادہ ۱۵ اکتوبر تک لکھنؤ پہونچنے کا عزم کر چکا تھا ہنوز حیدر آباد میں ہوں — لکھنے کو تو کہئے لکھ دوں کہ نومبر کے شروع میں یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا، لیکن کسے خبر ہے کہ یہ ارادہ بھی پورا ہوتا ہے یا نہیں۔

جہاں تک ظاہری تعلقات کا واسطہ ہے، میری دنیا بہت محدود ہے، اتنی محدود کہ "ہمیں جائے من و جائے تو باشد" سے زیادہ مجھے کوئی تمنا نہ کرنا چاہئے، لیکن جس وقت اپنے باطنی اضطرابات کو دیکھتا ہوں تو یہ جی چاہتا ہے کہ اگر میں دنیا پر نہ چھا جاؤں تو دنیا کو ضرور میرے اندر سمٹ کر آ جانا چاہئے۔

دنیا مجھے کافر کہتی ہے، مرتد بتاتی ہے، دشمن دین و ایمان ظاہر کرتی ہے — لیکن کیا کروں باوجود اس طرح بار بار ٹھکرائے جانے کے بھی یہ یقین دل سے کسی طرح محو نہیں ہوتا کہ نوع انسانی کی نجات کا ذریعہ اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔

اور باور کیجئے کہ میرا کوئی اقدام، میرا کوئی سفر، میری زندگی کا کوئی لمحہ اس مقصود سے خالی نہیں ہوتا — میرے لئے دنیا میں اب کوئی سیر و تفریح نہیں مگر یہ کہ میں اپنا کوئی ہمنوا پیدا کر سکوں، میری حیات کا کوئی مدعا نہیں بجز اس کے کہ میں اسلام کے حقیقی مفہوم سے دنیا کو آشنا کر سکوں اور یہی وہ خلش ہے جو مجھے کبھی کبھی یہاں لے آتی ہے اس لئے نہیں کہ یہاں اس پیام پر لبیک کہنے والے بہت ہیں، بلکہ صرف اس لئے کہ یہیں بہت کم ہیں —

بہرحال میں ان تمام احباب سے معافی چاہتا ہوں جن کے گرامی ناموں کا جواب اس دوران میں بروقت نہ دے سکا اور اُن حضرات سے بھی معذرت خواہ ہوں جن کے استفسارات کی طرف (دفتر سے دور ہونے کی وجہ سے) توجہ نہ کر سکا۔ چنانچہ یہ رسالہ باب المراسلہ و باب الاستفسار سے بالکل معرا شائع ہو رہا ہے۔ ان ابواب کی جگہ میں نے دوسرے مضامین سے پُر کر دی ہے اور امید ہے کہ اس ماہ کی اشاعت میں غیر معمولی سامان دلچسپی نظر آئے گا — مجھے سخت افسوس ہے کہ افسانہ "بیراگ کا بروگ" کا سلسلہ درمیان میں منقطع ہو گیا تھا۔ لیکن اب نومبر سے پھر شروع کر دیا گیا ہے اور دسمبر میں ختم ہو جائے گا۔

جنوری ۱۹۳۴ء کا رسالہ اپنے موضوع کے لحاظ سے جسقدر اہم ہوگا کسی سے مخفی نہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ میں اپنی طویل غیر حاضری کی وجہ سے ابھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ کن کن حضرات کے مضامین موصول ہوئے ہیں اور میں اپنی توقعات کو کس حد تک کامیاب دیکھوں گا۔ بہرحال ابھی وقت ہے اور جو اہل قلم اس باب میں میری اعانت کرنا پسند فرمائیں وہ اب بھی کرم فرما سکتے ہیں۔

پہلے میرا ارادہ تھا کہ خود کوئی مضمون نہ لکھوں گا، بلکہ تمام مضامین موصولہ پر اپنی رائے کے اظہار پر اکتفا کروں گا۔ لیکن بعد کو میں نے یہ خیال ترک کر دیا۔ اب آپ میرے کم از کم دو طویل مضمون جنوری کے رسالہ میں پڑھیں گے۔ ایک تو "اردو شاعری پر تاریخی تبصرہ" کے عنوان سے ہوگا اور دوسرا لکھنؤ کے ایک ایسے شاعر کے متعلق ہوگا جس سے دنیا اب تک بےخبر ہے، درانحالیکہ دہلی اسکول کے مقابلہ میں لکھنؤ ہی کی طرف سے ایک پیش کیا جا سکتا تھا۔

ہماری عورتوں کا پردہ

تمہید

اس سے قبل اس موضوع پر ہندوستان کے مختلف رسائل میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور یہ بحث اس قدر پامال ہے کہ اُسے از سر نو تازہ کرنے کو جی نہیں چاہتا، علاوہ اس کے معاشرت اور رسم و رواج سے متعلق جتنی چیزیں ہیں ان کا بہترین فیصلہ خود زمانہ کے ہاتھوں ہوا کرتا ہے اور وہ ہماری خامہ فرسائی کی محتاج نہیں ہوتیں۔ مثلاً اسی پردہ کی رسم کو لے لیجئے۔ اس کے متعلق ہمارے بزرگوں کے جو خیالات تھے وہ ہمارے نہیں اور جو ہمارے خیالات ہیں وہ ہماری اولاد کے نہ ہوں گے اس طرح زمانہ کی رفتار خود ہمارے رجحانات قایم کرنے میں بہترین اُستاد کا کام کرتی ہے اور ہمیں اس کے احکام پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ تاہم چونکہ اس موضوع پر اب تک جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ یا تو مذہبی بحثوں سے متعلق ہے یا ان غیر متعلق اعتراضات سے جو ہر فریق نے اپنے مخالفین پر کئے ہیں، اس لئے میرے لئے کہ میں ان دونوں سے اپنے مضمون کو حتی الوسع بچانا چاہتا ہوں ایک نئے نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر رائے زنی کی کافی گنجایش نکل آئے گی۔

اب رہی دوسری وجہ کہ زمانہ کا فتوے میرے اور آپ کے دستخط کا محتاج نہیں، اور ایک روز وہ ہم سب سے اپنے احکام کی تعمیل کرا کے چھوڑے گا، بالکل صحیح ہے لیکن انفرادی کوششیں اگر زمانہ کی رفتار کو بالکل روک نہیں سکتیں تو گھٹا یا بڑھا ضرور سکتی ہیں مثلاً اگر سر سید پیدا نہ ہوتے تو بھی آج ہندوستان کے مسلمان انگریزی تعلیم پانے اور ولایت جانے میں کوئی ہرج نہ سمجھتے اور کفر کے جو فتوے اُسوقت انگریزی خوانوں پر لگائے گئے تھے وہ اسی طرح ناپید ہو جاتے جس طرح اب ہو گئے ہیں لیکن فرق یہ ہوتا کہ اُس صورت میں مسلمان اس سے بھی زیادہ پست اور ذلیل ہوتے جتنے اب ہیں۔ یہی حال آج پردہ کا ہے۔ اگرچہ نسل حاضر اپنے بزرگوں کے بہ نسبت اس بارہ میں بہت آزاد خیال ہو گئی ہے پھر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہندوستان سے پردہ یا اُس کے حامی بالکل اُٹھ گئے۔

حامیان پردہ کے تین گروہ

آپ غور کریں گے تو معلوم ہو گا کہ پردہ کی حمایت کرنے والوں کے تین گروہ ہیں۔ ایک وہ جو اُسے صرف مذہبی احکام کی بناء پر ضروری سمجھتا ہے: دوسرا

وہ جس کا خیال ہے کہ پردہ بجائے خود ضروری نہیں لیکن ہندوستان کی تعلیمی پستی اور سیاسی حالت نے اسے ناگزیر بنا دیا ہے۔ تیسرا گروہ وہ ہے جو پردہ کو کسی خاص مقام یا کسی خاص مدت کے لئے نہیں بلکہ ہر ملک اور ہر عہد کے لئے ضروری سمجھتا ہے اور اس کا سبب یہ بتاتا ہے کہ پردہ کے بغیر عورت کی عفت وعصمت اور سوسائٹی کی اخلاقی حالت کبھی اچھی نہیں رہ سکتی۔ آئیے! اب ہم ان تینوں گروہوں کے خیالات پر ایک ایک کر کے غور کریں۔

پہلا گروہ۔ جو صرف مذہب کی بنا پر پردہ ضروری سمجھتا ہے

پہلے اس گروہ کو لیجئے جو پردہ کی نفع ومضرت سے بالکل قطع نظر کر کے صرف مذہبی احکام کی بنا پر اُس کی تائید کرتا ہے۔ قبل اس کے کہ میں پردہ کے بارہ میں کوئی مذہبی بحث چھیڑوں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اوامر ونواہی سے متعلق ایک عام اُصول آپ کے گوش گزار کر دوں۔ موجودہ زمانہ میں کسی رسم یا چیز کے متعلق یہ کہنا کہ فلاں مذہب اس کی اجازت دیتا ہے یا اس کی ممانعت کرتا ہے اُس رسم یا اُس چیز سے لوگوں کو باز رکھنے یا اس پر عمل کرانے کے لئے کافی نہیں جب تک آپ عقل کی رو سے یہ ثابت نہ کر دیں کہ وہ فعل بجائے خود مستحسن یا مذموم ہے۔ ایسے مذہبی احکام جو عقل کی کسوٹی پر نہیں کسے جا سکتے نہ صرف اُس خاص مذہب کے پیروں کے سوا اور سب کے لئے بیکار ہوتے ہیں بلکہ خود اسی مذہب کے پیرو جو ہر چیز کو عقل کی مدد سے جانچنا چاہتے ہیں وہ بھی ان کو قبول نہیں کرتے۔ فرض کیجئے کہ اس وقت کوئی اہلِ مذہب شرابخواری یا زنا کو رواج دینا چاہے تو صرف اس بنا پر کہ اس کے مذہب میں یہ چیزیں مباح ہیں۔ اسے اپنے مقصد میں بہت کم کامیابی ہوگی، اسی طرح اگر کوئی عیسائی لوگوں کو شادی بیاہ کی ممانعت کرتا پھرے یا کوئی جین مذہب کا پیرو کھانے پینے کی، تو غالباً ہم میں سے کوئی ذی ہوش آدمی عمر بھر مجرد رہنا یا دہی کھا کر جینا اس وجہ سے نہیں اختیار کرے گا کہ عیسوی مذہب اور جین مت کے احکام ایسے ہی ہیں بلکہ لوگ ایسے مذاہب سے دست بردار ہو جائیں گے جس کے احکام ناممکن العمل ہوں یا جنھیں فطرت انسانی قبول نہ کر سکتی ہو۔ جو لوگ اوامر ونواہی کے دائرہ کو ہمیشہ سخت تر کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں یہ سمجھ کر کہ وہ اس طرح نیکی کو دنیا میں عام کر رہے ہیں وہ در اصل اپنے مذہب کے فوائد و برکات کو عالمگیر ہونے سے روکتے ہیں۔

خوش قسمتی سے جہاں تک پردہ کا تعلق ہے ایسی کوئی پیچیدگی نہیں پیدا ہوتی۔ موجودہ مذاہب عالم میں صرف ایک اسلام ایسا مذہب ہے جس کی طرف پردہ منسوب کیا جاتا ہے اور مسلمان علما میں پردہ کے متعلق دو گروہ ہیں ایک کی رائے ہے کہ عورت نامحرم کے سامنے پہنچوں تک ہاتھ، ٹخنوں تک پاؤں اور چہرہ کھلا رکھ سکتی ہے، دوسرا اس کی اجازت نہیں دیتا لیکن اس پر دونوں کا اتفاق ہے کہ اگر عورت برقع اوڑھے یا چادر لپیٹ لے جس سے

اُس کے جسم کا کوئی حصہ کھلا نہ رہے تو پھر اُس کے باہر نکلنے میں کوئی عذر شرعی باقی نہیں رہتا۔

اب اگر پہلی تعبیر صحیح سمجھی جائے تو اُس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہماری عورتیں جس حالت میں اپنے گھروں میں رہتی ہیں اُسی حالت میں باہر نکل سکتی ہیں کیونکہ عام طور پر ہندی مسلمان عورتوں کا لباس ایسا ہوتا ہے کہ مذکورۂ بالا اعضا کے سوا اُن کے جسم کا کوئی حصہ کھلا نہیں رہتا۔ جب علما کی ایک جماعت مذہبی احکام کی یہ تعبیر کرتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم ایک سخت تر تعبیر کو ترجیح دیکر اپنی عورتوں کو خواہ مخواہ ایک تماشا بنائیں اور ضروریات زندگی میں دشواری پیدا کریں لیکن اگر آپ کو اس دوسری تعبیر پر ہی اصرار ہے تو آپ کم سے کم اسی پر عمل کریں اور اپنی عورتوں کو برقع ہی پہنا کر باہر نکالیں۔ آپ شاید یہ فرمائیں کہ "برقع پہن کر تو ہماری عورتیں اب بھی باہر نکلتی ہیں" مگر نہیں ایسا نہیں ہے۔ آپ شہر کے اس سرے سے اُس سرے تک نکل جائیے آپ کو کہیں کوئی شریف مسلمان عورت بے پردہ یا برقع میں نہیں دکھائی دے گی بجز ریلوے اسٹیشنوں کے پلیٹ فارم کے وہاں بھی اس لئے نہیں کہ مذہب اسلام برقع میں نکلنے کی اجازت دیتا ہے بلکہ اس لئے کہ اسٹیشنوں پر ڈولیاں اور میانے نہیں ہوتے۔ اگر ریلوے کے ارباب مقتدر سامان کے ٹھیلوں کی طرح اسٹیشنوں پر ڈولیوں اور فینسوں کا بھی انتظام کر دیں تو یقیناً اُس وقت آپ کو برقع کے متعلق مذہبی احکام کبھی یاد نہ آئیں اس سے معلوم ہوا کہ ہم اس مذہبی اجازت سے نہ فائدہ اُٹھاتے ہیں نہ اُٹھانا چاہتے ہیں الا اُن صورتوں کے جہاں بغیر اس کے کوئی چارہ نہیں۔ آخر اس کا کیا سبب؟ اسکا سبب یقیناً مذہب نہیں ہے کیونکہ مذہب تو ہر وقت باہر نکلنے کی اجازت دیتا ہے۔ بس آپ کو ماننا پڑے گا کہ پردہ کے اصلی اسباب مذہب اسلام کے احکام نہیں بلکہ کچھ اور ہیں اور اسلام اُن اصلی اسباب کو چھپانے کا صرف ایک بہانہ بنایا گیا ہے۔ یہ اصلی اسباب کیا ہیں؟ اس پر ہم آیندہ غور کریں گے۔

دوسرا گروہ - جو صرف ہندوستان کیلئے پردہ ضروری سمجھتا ہے

فی الحال اُس دوسرے گروہ کو لیجئے جس کا خیال ہے کہ پردہ فی نفسہ کوئی ضروری چیز نہیں لیکن ہندوستان کی تعلیمی پستی اور سیاسی حالت نے اُسے یہاں کے لئے ناگزیر بنا دیا ہے۔ جہاں تک میں غور کر سکا ہوں مجھے تو تعلیم اور پردہ میں کوئی خاص تعلق نظر نہیں آتا ممکن ہے کہ آپ طبیعیات کیمیا، فلسفہ، منطق یا تاریخ جغرافیہ اور پردہ میں کوئی تعلق پیدا کر سکیں اور یہ بتا سکیں کہ کیوں ایک ایسے شخص کے سامنے جو علوم بالا سے واقف ہو ایک عورت بے پردہ ہو سکتی ہے اور ایسے شخص کے سامنے نہیں ہو سکتی جسے بدقسمتی سے ان علوم کے حاصل کرنے کا موقع نہ ملا ہو۔ ان حضرات کے فرمانے کا خدانخواستہ یہ مطلب تو

نہیں ہو سکتا کہ تعلیم سے انسان کے جنسی خواہشات فنا ہو جاتے ہیں یا اس میں حسن پسندی کی صلاحیت نہیں باقی رہتی۔ اس لئے اگر اس کا کچھ مطلب ہو سکتا ہے تو صرف یہ کہ ایک تعلیمیافتہ آدمی اپنے جذبات پر بہ نسبت ایک جاہل آدمی کے زیادہ قابو رکھ سکتا ہے لیکن جہاں تک پردہ کا تعلق ہے حقیقت حال اس کے برعکس ہے۔ ایک تعلیم یافتہ آدمی ہمیشہ ایک جاہل آدمی کے بہ نسبت زیادہ حساس و اثر پذیر طبیعت رکھتا ہے جو خصوصیت کے ساتھ جنسی اثرات کے قبول کرنے کی طرف زیادہ مائل ہوتی ہے یہی سبب ہے کہ آج وہ تعلیم یافتہ لوگ جو اپنی عورتوں کو جہلا سے پردہ کرانے پر زیادہ مُصر نہیں تعلیم یافتہ لوگوں سے بطور خاص چھپانے کی کوشش کرتے ہیں چنانچہ آپ نے اکثر گھروں میں دیکھا ہوگا کہ خواتین اپنے خدمتگاروں، درزیوں، دھوبیوں، بھشتیوں وغیرہ کے سامنے نکل آتی ہیں وہ ہم سے آپ سے ضرور گہرا پردہ کرتی ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ محض ایک بہانہ ہے جو تعلیم یافتہ طبقہ نے اپنے بچاؤ کے لئے تراشا ہے۔ اگر آج ہندوستان کی بیشتر آبادی تعلیمیافتہ ہوتی تو غالباً یہ لوگ عوام کی جہالت کا عذر کرنے کے بجائے اُن کے تعلیم یافتہ اور ذکی الحس ہونے کا عذر کرتے۔

ہندوستان کی سیاسی حالت کا جو لوگ عذر کرتے ہیں اس سے ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں کوئی ایک قوم نہیں بستی بلکہ کئی قومیں آباد ہیں جو رسم و عادت اور نسل و مذہب کے اعتبار سے بالکل مختلف ہیں۔ اس لئے یہ حضرات سمجھتے ہیں کہ ایسے مختلف الحال لوگوں کو ایک دوسرے کی عزت کا کچھ پاس نہیں ہو سکتا اور ایسے ملک میں عورتوں کا بے پردہ ہونا خطرہ سے خالی نہیں۔ لیکن اگر ہندوستان میں کوئی آئینی حکومت نہ ہوتی بلکہ طوائف الملوکی کا دور ہوتا تو بیشک یہ عذر صحیح تھا لیکن موجودہ زمانہ میں جبکہ یہاں کی آئینی تنظیم دنیا کے کسی ملک سے پیچھے نہیں اس امر کا بعید ترین امکان بھی نہیں کہ کوئی جماعت غالب اپنے سے کم تعداد والی جماعت کی عورتوں کو بہ جبر لے بھاگے گی یا بے عصمت کر دے گی۔

آپ روزمرہ سیکڑوں فرنگی، پارسی، یہودی اور ہندو عورتوں کو کھلے بندوں پھرتے دیکھتے ہیں لیکن کبھی آپ نے دیکھا کہ کوئی پارسی کسی فرنگن پر یا کوئی ہندو کسی یہودن پر صرف اس لئے حملہ آور ہوا ہو کہ وہ اُس کی ہم مذہب نہیں؟ وہ فرقہ وارانہ مناقشات جو کبھی کبھی ہمارے ملک میں رونما ہوتے رہتے ہیں اس پردہ کو جائز قرار دینے کے لئے بالکل ناکافی ہے کیونکہ جب مذہبی یا فرقہ داری جنون میں جہلا آپے سے باہر ہو جاتے ہیں تو عورتیں خواہ بازار میں پھر رہی ہوں یا گھروں میں بیٹھی ہوں یہ از خود رفتہ مجمع بہر صورت اُن پر حملہ کر سکتا ہے اس لئے صرف ایسے حملوں کے ڈر سے گھر دیں

چھپ رہنا ایسا ہی دانشمندانہ فعل ہے جیسے ٹھوکر لگنے کے خوف سے چلنا پھرنا موقوف کر دینا۔

تیسرا گروہ - جو پردہ کی عالمگیر ضرورت سمجھتا ہے

اب اُس تیسرے گروہ کی طرف آیئے جو یہ سمجھتا ہے کہ عورت کی عفت و عصمت اور سوسائٹی کی اخلاقی حالت برقرار رکھنے کے لئے پردہ بلا لحاظ ملک و ملت ضروری ہے۔ اس جماعت کا خیال ہے کہ ہندوستان کی پردہ دار عورتیں ساری دنیا کی بے پردہ عورتوں سے زیادہ پاکدامن ہیں اور چونکہ ان کے نزدیک عورتوں کی عصمت کا جوہر صرف پردہ کی آڑ میں محفوظ رہ سکتا ہے اس لئے وہ نہیں چاہتے کہ پردہ اُٹھا کے اپنی عورتوں کو ایسے قیمتی جوہر سے عاری کر دیں۔ لیکن افسوس ہے کہ میں اس دعوے میں اجتماع ضدین ثابت پاتا ہوں۔

باعصمت عورت کیلئے پردہ

کسی عورت کی عصمت برقرار رکھنے کے لئے پردہ کو ناگزیر قرار دینا گویا اسبات کا اقرار کرنا ہے کہ خود آپ کو اس عورت پر اعتماد نہیں اور آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ پردہ سے باہر آئی تو اپنے نفس پر قابو نہ رکھ سکیگی۔ پس یہ کہنا کہ باعصمت عورت کے لئے پردہ ضروری ہے بہ الفاظ دیگر یہ کہنا ہے کہ وہ عورت باعصمت بھی ہے اور بے عصمت بھی، جو بالکل مہمل ہے۔ آپ خود غور فرمایئے کہ آخر باعصمت سے آپ کی کیا مراد ہے۔ ایک عصمت کو چھوڑئے۔ دنیا کی کسی اور صفت کو لے لیجئے۔ مثلاً آپ ایک شخص کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ وہ "دیانت دار" ہے تو اس سے آپ کا کیا مطلب ہوتا ہے یہی نا کہ اس کو بد دیانتی کے مواقع تو حاصل ہیں لیکن وہ بد دیانتی نہیں کرتا۔ اسی طرح جب آپ اپنی عورتوں کے متعلق یہ فرماتے ہیں کہ وہ باعصمت ہیں، تو اس سے آپ کا یہی مطلب سمجھا جائے گا کہ اُنھیں بے عصمت ہونے کے مواقع تو حاصل ہیں مگر وہ بے عصمت نہیں ہوتیں لیکن اگر بے عصمتی کے ان موقعوں سے آپ کی یہی مراد ہے کہ گھر کی چار دیواری میں (جہاں غیر مرد کی پرچھائیں تک نہیں دکھائی دےسکتی) نہایت سختی کے ساتھ مقید ہونے، اور اپنے ساس، سسرے، باپ، بھائی، دیور، جیٹھ حتے کہ ماماؤں اور اناؤں تک کی انتہائی نگرانی میں رہنے کے باوجود وہ بے عصمت نہیں ہوتیں تو میں یہ دعوے بھی کر سکتا ہوں کہ قید خانے تمام اُن نفوس قدسیہ سے معمور ہیں جو برقندازوں، فلک بوس دیواروں، مہلک برقی تاروں، آہنی سلاخوں اور موٹی موٹی زنجیروں کے باوجود برسوں کسی گناہ بلکہ معمولی قصور کا بھی ارتکاب نہیں کرتے اور ہم سب سے زیادہ پاک، نیک و سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ پھر اگر آپ ان پر نیک اور پارسا کا اطلاق کرنے کے لئے تیار ہیں، تو میں بھی آپ کی عورتوں کو باعصمت سمجھنے کے لئے تیار ہوں لیکن اگر آپ انھیں پارسا سمجھنے میں صرف اس لئے تامل کرتے ہیں کہ انکی پارسائی نارسائی کا دوسرا نام ہے تو میں چاہتا ہوں کہ اسی اُصول کو آپ اپنی عورتوں سے بھی متعلق کیجئے۔ یعنی اگر

آپ کو اس پر اصرار ہے کہ جو نیکی قید و زنداں کی محتاج ہے وہ در اصل نیکی نہیں ہے تو آپ کو اس پر بھی اصرار ہونا چاہئے کہ جو عصمت آپ کے گھر کی چار دیواری کی محتاج ہے وہ در اصل عصمت کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی۔

اس کے جواب میں یہ نہ فرمائیے گا کہ "یہ پردہ تو عورتوں نے مردوں کے جبر سے نہیں بلکہ اپنی خوشی سے اختیار کیا ہے" کیونکہ دنیا میں کوئی ذی روح جس میں زندگی کی ذراسی بھی اُمنگ اور جذبات کی ترنگ باقی ہے اس ظالمانہ اور غیر فطری قید کو خوشی سے برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ ایک دائم الحبس قیدی کی طرح چار دیواری میں بیٹھے بیٹھے اس کی حس مردہ ہو گئی ہو اور اب اس قید کی اتنی تکلیف اُسے محسوس نہ ہوتی ہو جتنی ایک اوسط جذبات کے ذی روح کو ہونی چاہئے۔ اگر آپ کو میرے بیان میں شک ہے تو آپ زیادہ نہیں صرف ایک ہفتہ کے لئے اپنے مکان کے سوا چھ گز صحن میں مقید ہو جائیے پھر دیکھئے آپ کی کیا حالت ہوتی ہے۔ فرض کیجئے کہ آپ کی بیوی خود بے پردہ ہونا چاہیں تو کیا آپ انھیں اس کی اجازت دیں گے؟ ممکن ہے اب آپ ایک نئی ترکیب نکالیں جس سے آپ کا مقصد بھی حاصل ہو جائے اور آپ کی بیوی بھی ناراض نہ ہوں۔ یعنی آپ اُن سے یہ فرمائیں کہ "مجھے تم پر تو کامل اعتماد ہے مگر اس کو کیا کیا جائے کہ اپنی سوسائٹی کے مردوں کی طرف سے بالکل اطمینان نہیں"۔

ممکن ہے کہ اس جواب سے آپ کی بھولی بھالی بیوی کی تشفی ہو جائے۔ لیکن اس سے کم از کم میری تشفی نہیں ہو سکتی۔ مردوں کی دست درازی دو صورتوں سے خالی نہیں۔ یا تو وہ عورت کی رضامندی سے ہو گی یا اس کی خلاف مرضی۔ پہلی صورت میں نہ تو وہ عورت آپ کے اعتماد کی مستحق ہے نہ باعصمت کہلائے جانے کی۔ اس لئے ایسی عورتوں سے یہاں ہمیں کوئی بحث ہی نہیں۔ اب رہی دوسری صورت سو اس کے متعلق قانون میں جو سخت سزا مقرر ہے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔ اب فرض کیجئے کہ خدانخواستہ ایک ایسے بدمعاش کی نیت آپ کی بیوی کے متعلق بدل جائے جو یہ سزا بھگتنے کے لئے تیار ہو تو اُس کے لئے شاہراہ، پارک، اور گھر سب برابر ہیں بلکہ دن کے وقت بھری سڑک یا بارونق پبلک گارڈن میں حملہ کرنے سے بدرجہا زیادہ آسان تو اُس کے لئے رات کو اس کی خوابگاہ پر دھاوا کرنا ہوگا۔

اس کے جواب میں شاید آپ یہ فرمائیں کہ "جب میں اپنی بیوی کو پردہ کراؤں گا تو اس بدمعاش کو اسکا علم ہی کیسے ہو گا کہ میری ایک بیوی ہے جو جوان بھی ہے اور حسین بھی" لیکن آپ کا یہ جواب صحیح نہیں۔ آپ ہی فرمائیے کہ آپ کے کتنے عزیز، دوست، ہمسایہ، ہم محلہ، ایسے ہیں جن کے متعلق آپ کو بخوبی معلوم ہے کہ ان کی بیوی یا بہن یا بیٹی یا سالی جوان بھی ہے اور حسین بھی۔ لیکن کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ نے انکے گھروں پر کتنی دفعہ کمند ڈالنے کی

کوشش کی؟

اس موقع پر آپ یہ کہیں گے کہ "بغیر صورت دیکھے ایسا اشتیاق نہیں ہو سکتا لیکن صورت دیکھنے کے بعد بیشک ایسا اشتیاق پیدا ہو سکتا ہے۔"

مگر تجربہ اسکی بالکل تائید نہیں کرتا - آپ ہی فرمائیے کہ روزانہ آپ کو کتنی حسین اور جوان فرنگی، پارسی، یہودی اور ہندو عورتوں کے دیکھنے کا موقع ملتا ہے؟ لیکن کیا انھیں دیکھ کر آپ کا اشتیاق کبھی اس درجہ پر پہونچا کہ آپ نے ان کی موٹروں کے نمبر نوٹ کرکے ان کی خوابگاہوں پر شبخون مارا ہو؟ - اتنی بحث کے بعد غالباً اس حد تک تسلیم کرنے میں آپ کو تامل نہ ہوگا کہ جن عورتوں کی عصمت پر آپ کو کامل اعتماد ہے یعنی جن کے متعلق آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اُنھیں کسی قسم کی ترغیب و تحریص راہ راست سے نہیں ہٹا سکتی، وہ خواہ پردہ میں ہوں یا بے پردہ اس سے سوسائٹی کی اخلاقی حالت پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑ سکتا اور ان کی حد تک پردہ اگر مضر نہیں تو بیکار ضرور ہے۔

بے عصمت عورت کیلئے پردہ

اب رہیں وہ عورتیں جن کی عصمت پر آپ کو اعتماد نہیں - انکے متعلق آپ فرمائیں گے کہ "چونکہ ان کی طرف سے سوسائٹی میں جسمانی اور اخلاقی خرابیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے اس لئے اُن کا پردہ میں بٹھایا جانا ضروری ہے - اس پردہ سے خواہ مجبوری درجہ سہی لیکن سوسائٹی کی عافیت تو قائم رہیگی جس طرح زنداں کے قیدی کہ گو جرائم سے بدرجۂ مجبوری باز رہتے ہیں لیکن اُن کے قید ہونے سے ہماری زندگی تو آرام سے کٹ رہی ہے۔"

اگر آپ نے دنیا کے موجودہ رجحانات کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے تو جانتے ہوں گے کہ پردہ کی طرح قید خانوں کی سلاخیں بھی آج ارتکاب جرائم سے لوگوں کو باز رکھنے میں ناکام ثابت ہو رہی ہیں اور فی الواقع انھیں ہونا بھی یہی چاہئے تھا - اس لئے کہ جب تک مرض کے اسباب رفع نہ ہوں مرض کبھی زائل نہیں ہو سکتا - غلط تعلیم اور غلط تقسیم دولت وہ اساسی سنگ و خشت ہیں جن پر دنیا کے تمام جرائم کی تعمیر ہوا کرتی ہے - اگر آج صحیح تعلیم اور دولت کی مساوی تقسیم شروع ہو جائے تو آپ دیکھیں گے کہ قید خانوں کی کوٹھریاں خود بخود سونی ہونی شروع ہو جائینگی۔ یہی حال پردہ کا ہے - فرق صرف اتنا ہے کہ قیدی اپنے کئے کی سزا بھگتتے ہیں اور ہماری عورتیں ناکردہ گناہوں کی۔ لیکن اگر آج آپ اُن اسباب کو پوری طرح رفع کر دیں جو عورتوں کی بے عصمتی کا باعث ہو سکتے ہیں تو آپکو پردہ کی کوئی ضرورت ہی نہ پڑے گی بلکہ آپ دیکھیں گے کہ ان اسباب میں ایک بڑا سبب خود پردہ ثابت ہوگا۔

اب آپ ذرا اس پر غور فرمائیے کہ کسی عورت کی بے عصمتی کے کیا اسباب ہو سکتے ہیں - یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے

کہ اگر کسی شخص کی خواہشیں ایسے طریقوں سے پوری ہو سکتی ہیں جنھیں اُس کے ہمنشیں برا نہیں سمجھتے تو کبھی وہ انھیں چھوڑ کر ایسے طریقے نہیں اختیار کریگا جسے اس کے ہم چشم معیوب سمجھتے ہوں۔ اگر آپ کی ایک پر تکلف دعوت کسی دوست کے ہاں ہو تو آپ کھانے کا کمرہ چھوڑ کر اس کے باورچی خانے میں چوری کے لئے نہیں جائیں گے۔ لوگوں کے باورچی خانے تلاش کرنے کی ضرورت آپ کو اُسی وقت پیش آئے گی جب خود آپ کا باورچی خانہ خالی ہو۔ یہی حال انسان کی ہر خواہش کا ہے۔ اس میں عورت اور مرد کی کوئی تخصیص نہیں۔ بلکہ فطرتاً عورت مرد سے زیادہ شرمیلی ہوتی ہے خصوصاً جنسی معاملات میں، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اگر اُس کی فطری خواہشات کی تکمیل اُن طریقوں سے ہوتی رہی جنھیں وہ جائز سمجھتی ہے تو وہ کبھی ایسے طریقے نہ اختیار کرے گی جو اس کے نزدیک ناجائز ہوں لیکن اگر آپ یہ چاہیں کہ تمام جائز راستے اس کے لئے بند کر دیں اور اس کے باوجود یہ توقع رکھیں کہ وہ کوئی ناجائز راستہ نہ نکالے گی تو یہ آپ کی غلطی ہے۔ وہ نکالے گی اور اسی طرح نکالے گی جس طرح ہم اور آپ ایسی صورتوں میں نکالتے ہیں خواہ آپ اُسے پردہ میں بٹھائیں یا بے پردہ پھرائیں۔ فرق صرف اتنا ہوگا کہ بے پردگی کی صورت میں وہ بہتر سے بہتر چیز جو تلاش و جستجو سے میسر آسکتی ہے بہم پہونچائے گی اور پردہ کی صورت میں جو کچھ برا بھلا مل جائے اسی پر قانع ہو جائے گی۔ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ اپنے ملک میں بدکاری اور عصمت فروشی کا بازار گرم ہونے دیں تو اس کی تدبیر یہ نہیں ہے کہ آپ عورتوں کو چار دیواری میں بٹھا دیں یا کسی صندوق میں مقفل کر دیں۔ یہ طرز عمل انھیں جسمانی بدکاری سے اگر بچا بھی سکا تو ایسی سخت ذہنی بدکاری میں مبتلا کر دے گا جسمیں ہم میں سے ننانوے فیصدی آج کل مبتلا ہیں۔ شاید یہ ذہنی بدکاری آپ کی سمجھ میں نہ آئے لیکن یہ موقع اُس کی تشریح کا نہیں ہے آگے چل کر میں اس کا تفصیلی ذکر کروں گا فی الحال مجھے اصل بحث پر آنے اور وہ تدبیریں بتانے دیجئے جو عورتوں کی بے عصمتی کے اندیشوں کو دور کر سکتی ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی عورتیں باعصمت رہیں تو آپ اُنھیں اس کی کامل آزادی دیجئے کہ وہ جب چاہیں اور جس سے چاہیں شادی کریں، جب تک چاہیں اسکے ساتھ رہیں۔ جس وقت اُس سے تعلق منقطع کرنا چاہیں اسی آسانی سے کر سکیں جس آسانی سے ان کے شوہر اُن سے کر سکتے ہیں۔ بچپن کی نسبتیں، جوان ہونے کے بعد لڑکیوں کو اُن کی خلاف مرضی شادی سے روکنا، انتخاب شوہر میں اپنی مرضی کو ان کی مرضی پر مقدم رکھنا، اُنھیں اپنے ہونے والے شوہروں سے ملنے اور تبادلۂ خیال کرنے کا موقع نہ دینا عقد کو ایک عقدۂ لاینحل بنانا، طلاق اور خلع میں مشکلات پیدا کرنا بھاری بھاری مہر باندھنا جو کبھی ادا ہی نہ ہو سکیں، بیواؤں اور مطلقہ عورتوں کے عقد ثانی کو معیوب سمجھنا، عورتوں کو مالی مشکلات میں پھنسا دیکھنا لیکن

ان کو پردہ سے نکل کر خود کھانے کمانے کے قابل بننے کی اجازت نہ دینا، اُن کو جاہل بے وقوف اور معاملات دنیوی سے بے خبر رکھنا یہ اور اسی قسم کے اور سیکڑوں رسوم و مظالم ہیں جو در اصل بے عصمتی کے بیج نہیں درخت ہیں - اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ جوان لڑکیوں کو جاہل اور جنسی معاملات سے بے خبر رکھیں اس کے ساتھ ہی دس ہزار کا جہیز تیار ہونے تک کنواری رہنے پر مجبور کریں، جب شادی کریں، تو انتخاب شوہر میں انکی رائے نہ لیں - اگر شوہر بدمزاج، بدزبان بدصورت بدمعاش، جاہل، امراض میں مبتلا یا جنسی اعتبار سے کمزور ہو تو بھی وہ اسی کو نباہتی چلی جائیں، اگر خوش قسمتی سے ایسا شوہر مر جائے یا طلاق دیدے تو عقد ثانی نہ کریں، وہ فاقوں مر جائیں مگر بے پردہ ہو کر خود کھانے کمانے کے قابل نہیں تو اس کا وہی انجام ہوگا جس کا آپ کو اندیشہ ہے - اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ایک پردہ ان سب خرابیوں کی تلافی کر سکتا ہے تو مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ ع ' ایں خیال است و محال است و جنوں ' - میں یہ دعوےٰ نہیں کر سکتا کہ ان سب اُمور کی اصلاح کر دی گئی تو ہندوستان کے طول و عرض میں کسی بے عصمت عورت کا وجود نہ رہیگا - جب تک دُنیا قایم ہے اس میں ضرور ایسی عورتیں اور مرد ملیں گے جو بغیر کسی اور وجہ کے محض زنا کی خاطر زنا کرنا چاہتے ہیں لیکن کیا آپ اس کا دعوےٰ کر سکتے ہیں کہ پردہ نے ایسی ہستیوں کو یا اُن کے مواقع کو بالکل مٹا دیا ہے ؟ اگر نہیں تو پھر ایسے مستثنیات کی خاطر کسی ملک کی ایک کثیر آبادی کو معذور و مفلوج بنا دینا کونسی عقلمندی ہے ؟ ممکن ہے ایک معترض یہ کہے کہ " ان اصلاحات کے لئے تو ابھی عرصہ چاہئے - اُس وقت تک ہم اپنی عورتوں کو بے پردہ کر کے خواہ مخواہ کیوں مصیبت مول لیں " لیکن اُسے معلوم ہونا چاہئے کہ یہ ' مصیبت ' اب اس کے اختیار کی نہیں رہی - اور اگر وہ بروقت اس کا حل نہ سوچے گا تو یہ ایک خطرناک صورت اختیار کر لیگی - یہ معترض اس گزرگاہ عالم میں اگر ایک اندھے فقیر کی طرح نہیں بیٹھا ہے بلکہ ایک صاحب نظر دور اندیش کی طرح کھڑا حالات و واقعات کا بنظر غایر مطالعہ کر رہا ہے تو جانتا ہوگا کہ اب اُس کی عورتیں ان مظالم کو اُسی خاموشی سے برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں، رہیں جس طرح صدیوں سے کرتی چلی آئی تھیں - زمانہ نے اپنا ورق اُلٹ دیا ہے اور مغربی آزادیوں کی لہریں بحیرہ عرب کے اِس کنارہ پہونچ چکی ہیں - یہ بالکل جدا سوال ہے کہ یہ ' اچھا ہوا یا برا ' ؟ اس پر غور کرنے کا وقت گزر گیا اب تو یہ صورت آپڑی ہے کہ ع ورنہ ستانی بہ ستم میرسد - میں آگے چل کر تفصیل سے وہ وجوہ بتاؤں گا جن کی بناء پر عورتیں ابتک مردوں کی محکوم رہتی چلی آئی تھیں - یہاں آپ میری خاطر یہ مان لیجئے کہ وہ وجوہ اب باقی نہیں رہے ہیں اس لئے یا تو آپ پردہ اُٹھائیے اور عورتوں کو اُن تمام مظالم سے نجات دلائیے جن میں سے چند کا اوپر ذکر ہوا یا اُن عواقب و نتائج کو برداشت کرنے کے لئے تیار رہئے جو آپ کی ہٹ دھرمی سے لازمی طور پر پیدا ہونگے -

یہ بالکل غلط خیال ہے کہ یورپ کے مردوں نے اپنی خوشی سے عورتوں کو اس قدر آزادیاں دی تھیں۔ یہ آزادیاں عورتوں نے اپنی قوت بازو سے حاصل کی ہیں اور اب انھیں قائم رکھنے کے لئے وہ اپنے خون کا آخری قطرہ بھی بہا دیں گی۔ یہی حال آپ کا ہونا ہے۔ اگر آپ نے اپنی خوشی سے عورتوں کے تمام جائز مطالبات پورے نہیں کئے ان کو اُن مظالم کے بارے ہلکا نہیں کیا جن میں وہ صدیوں سے دبی چلی آتی ہیں اور ان کے وہ حقوق واپس نہیں کئے جو اب تک غصب کر رکھے ہیں تو آپ کا یہ پردہ کچھ کام نہ آئے گا اور بہت جلد آپ کو اُن آلام و مصائب کا شکار ہونا پڑے گا جو ہر انقلاب کے اجزائے لاینفک ہیں۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ آنے والے خطرات سے ڈر کر آپ اپنی عورتوں کو شترِ بے مہار کی طرح چھوڑ دیجئے۔ نہیں۔ اگر آپ اُن کی ایسی نگرانی اور رہنمائی کریں جیسے ایک دوست اپنے دوست کی کرتا ہے تو خود عورتیں مشکلاتِ زندگی میں آپ کا سہارا ڈھونڈیں گی۔ لیکن اگر اس کے برخلاف آپ نے قفل کنجی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو پھر آپ کی عافیت اور سوسائٹی کے شیرازہ کی خیر نہیں۔

یہ درست ہے کہ یورپ کے بعض شہروں میں ایک خلافِ نسوال تحریک شروع ہوگئی ہے اور میں اس تحریک سے واقف ہوں اور آگے چلکر میں آپ کو بھی اس کی حقیقت سے واقف کراؤں گا فی الحال مجھے ایک مثال کے ذریعہ اُس طرزِ عمل کو واضح کرنے دیجئے جو پردہ اُٹھانے کے بعد آپ کو اپنی عورتوں کے ساتھ اختیار کرنا پڑے گا۔

فرض کیجئے کہ ایک شخص نے اپنی جوان لڑکی کو بے پردہ کر دیا ہے۔ اب اگر اُس کی عفت و عصمت پر اسے کامل اعتماد ہے تو سبحان اللہ! اس سے بہتر کیا بات ہے۔ لیکن اس کے برخلاف اگر کچھ شک و شبہ ہے تو وہ سوال کریگا کہ "ایسی صورت میں کیا کرنا چاہئے؟" اس کا جواب بہت آسان ہے۔ اس کو لڑکی کے ساتھ بالکل وہی طرزِ عمل اختیار کرنا چاہئے جو ایسی صورتوں میں وہ اپنے لڑکے کے ساتھ اختیار کرتا۔ اب اگر اس کو اپنے پدری فرائض کا کماحقہ احساس ہے تو ایسی صورتوں میں وہ اپنے لڑکے کے ساتھ کیا کرتا؟ یہی نا کہ اُسے سمجھاتا بجھاتا، اچھی تعلیم دلاتا، اچھی صحبت میں بٹھاتا اور اگر مالی حالات اجازت دیتے تو شاید اس کی شادی بھی کر دیتا۔ لیکن یہ تو نہ کرتا کہ اُس کے کان اور ناک چھید کر ٹاٹ کے پردوں میں مقید کر دیتا۔

عقل، مذہب، اخلاق اور معاشرت کی رو سے ایک مرد کی بے عصمتی اُسی قدر مذموم، ناپسندیدہ، خطرناک اور مہلک ہے جتنی کہ ایک عورت کی، پھر کیا وجہ کہ آپ ایک کی پاکدامنی کو تو اتنی اہمیت دیں کہ فقط شبہ پر بطور حفظ ما تقدم اُس کو مقید کر دیں اور دوسرے کی عفت مآبی سے اسقدر غافل ہوں کہ وہ جتنا چاہے خراب ہوئے کوئی دار و گیر نہیں؟ آپ کا اپنی لڑکی کی عصمت کو اسقدر غیر معمولی اہمیت دینا اتنا ہی قابلِ اعتراض اور نازیبا فعل ہے

جتنا کہ اپنے لڑکے کی آوارگی سے اغماض کرنا- اسی پر آپ اور صورتوں کو بھی قیاس کر لیجئے- مثلاً آپ کو اپنی بیوی کی عصمت پر شبہ ہو تو کیا کرنا چاہئے؟ وہی جو آپ کی بیوی اُس صورت میں کرتی جب اسے آپ کی عصمت پر شبہ ہوتا وہ آپ کو سمجھاتی، مناتی، ڈراتی، دھمکاتی اور اگر اس پر بھی آپ اپنی حرکتوں سے باز نہ آتے تو وہ خلع لیکر کوئی اور شوہر تلاش کر لیتی لیکن یہ تو نہ کرتی کہ آپ کو پکڑ کر پردہ میں بٹھا دیتی یا آپ کے کان اور ناک کاٹ لیتی یا چھُرا لیکر آپ کو ذبح کر دیتی جیسا کہ اکثر مردوں کے متعلق آئے دن سُنا جاتا ہے- ان مثالوں کی وجہ سے مجھے مجبوراً اس جگہ ایک اور ایسی بحث کا چھیڑنا ضروری معلوم ہوتا ہے جسے میں چاہتا تھا کہ ابھی شروع نہ کروں-

میں نے اپنے اکثر تعلیم یافتہ احباب کو یہ کہتے سُنا ہے کہ چونکہ مرد جسمانی اعتبار سے عورت کے بہ نسبت، قوی ہوتا ہے اس لئے اُس میں اور عورتوں میں کسی طرح کی مساوات ہو ہی نہیں سکتی- وہ سمجھتے ہیں کہ اس جسمانی تفوق کی بناء پر مرد عورتوں کو نہ صرف پردہ میں رکھ سکتا ہے بلکہ عند الضرورت اُن کے ساتھ ایسے بہیمانہ افعال کا بھی مرتکب ہو سکتا ہے جن کا اوپر ذکر ہوا- ان کا خیال ہے کہ مرد کا عورت سے جسمانی قوت میں زیادہ ہونا خود اس بات کی دلیل ہے کہ قدرت عورت کو مرد کا مطیع رکھنا چاہتی ہے- لیکن کیا اس منطق کا لازمی اقتضا یہ نہ ہوگا کہ آج سے بجائے اسکے کہ آپ اپنے گھوڑے پر سواری کریں آپکا گھوڑا آپ پر سواری کرنے لگے گا- اسلئے کہ وہ یقیناً جسمانی قوت میں آپ سے زیادہ ہی غالباً صرف یہ ایک مثال اس احمقانہ مغالطہ سے نکالنے کے لئے کافی ہو جائے گی کیونکہ بدقسمتی سے اس کائنات کی بیشتر مخلوق جسمانی اعتبار سے آپ کے بہ نسبت قوی تر ہے اور مخلوق کو جانے دیجئے خود انسانوں ہی کی مختلف قوموں اور نسلوں میں جسمانی اعتبار سے اتنا فرقِ عظیم ہے کہ اگر یہ اُصول جائز قرار دے لیا جائے تو آج ہم سب اپنے گھروں میں آرام سے بیٹھنے کے بجائے افریقہ کے ریگستانوں میں بوجھ ڈھوتے پھریں گے-

محمد اعظم خاں- ام-اے

(باقی آئندہ)

ضرورت ہی شوہر کی

ایک ۱۸ سال کی نوجوان، خوشرو، سلیقہ مند اور تعلیم یافتہ لڑکی کے لئے — معاش کی طرف سے اطمینان ہونا چاہئے، اور عمر ۳۰ سال سے زاید نہ ہو- یوپی کے باشندہ کو ترجیح دی جائے گی — اڈیٹر صاحب نگار سے ہر طرح کا اطمینان کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ لڑکی اور اس کے خاندان سے بخوبی واقف ہیں-

خط و کتابت اس پتہ سے کی جائے:- ا-ن- ذریعہ منیجر نگار لکھنؤ

بدمعاش

چالیس دن سے وہ برابر چل رہا تھا، ہر جگہ کام تلاش کر رہا تھا اور اُس نے اپنا وطن ولیاوری کام نہ ملنے کی وجہ سے چھوڑ دیا تھا۔ وہ ایک اچھا نجار ستائیس سال کا قوی اور شریف انسان دو ماہ سے خاندان والوں کی روٹیاں توڑ رہا تھا۔ وہ جو کہ خاندان کا سب سے بڑا لڑکا تھا۔ اُس کے لئے کرنے کو کچھ نہ تھا سوائے اس کے کہ عام بیروزگاری کے سلسلے میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہے۔ گھر میں روٹی کی قلت تھی، دونوں بہنیں کام کاج کرتیں لیکن مضبوط اور تنومند راڈل دوسروں کے ٹکڑے توڑتا اور خود کچھ نہ کرتا تھا۔ اُس کے کرنے کے لئے کچھ تھا ہی نہیں۔

اُس نے گاؤں کے اکثر و بیشتر آدمیوں سے سُنا تھا کہ وسطِ فرانس میں کام مل سکتا ہے۔

اس لئے وہ کاغذوں اور اسناد سے مسلح ہو کر اور سات روپیہ لیکر چل کھڑا ہوا کاندھے پر ایک نیلے رومال میں جو لکڑی کے سرے سے بندھا تھا ایک جوڑا جوتا ایک قمیص اور دو پتلون لپٹے ہوئے تھے۔

وہ بغیر سستائے ہوئے دن رات دھوپ اور بارش میں چلا آرہا تھا اور اُس سرزمین کا جہاں کاریگروں کو کام ملتا ہے کہیں پتہ نہ تھا۔

پہلے پہل اُس کا مصمم ارادہ تھا کہ چونکہ وہ نجار ہے اس لئے سوائے نجاری کے اور کوئی کام نہ کرے گا۔ لیکن تمام کارخانوں میں جہاں جہاں اُس نے اپنے آپکو پیش کیا اس سے کہا گیا کہ اُنھوں نے کام کی کمی کے باعث آدمیوں کو کم کر دیا ہے اس لئے اس نے بھی اپنے روپیوں کو قریب الختم دیکھ کر ارادہ کر لیا کہ جو کام بھی اسے مل جائیگا کر لیگا۔

اُس کے بعد وہ باری باری مزدور، سائیس اور سنگ تراش کا کام کرتا رہا۔ وہ لکڑیاں چیرتا، کنوئیں کھودتا، کیچڑ بہاتا، ایندھن کے گٹھر باندھتا، پہاڑوں پر بھیڑوں کو چراتا، اور سب کچھ کرتا، صرف چند پیسوں کی خاطر۔ کیونکہ اُسکو صرف عارضی کام ملتا تھا اور وہ بھی اپنے آپ کو نہایت ہی کم اُجرت پر پیش کر کے کاشتکاروں اور کام لینے والوں کو لالچ دلانے کے بعد۔

اب ایک ہفتہ سے اُس کو کوئی کام نہ ملا تھا۔ اُس کے پاس ایک جھنجی کوڑی نہ تھی۔ اُس کی زندگی کا انحصار اُن

چند روٹی کے ٹکڑوں پر تھا جن کو اُس نے راہ چلتے بھیک سے حاصل کیا تھا۔

جھٹ پٹا ہونے لگا تھا۔ اور تھکا ماندہ راڈل بھوکا، شکستہ دل، برہنہ پا، سڑک کے کنارے گھاس پر چلا جا رہا تھا کیونکہ جوتے کبھی کے پھٹ چکے تھے۔ خزاں کا آخری موسم تھا اور سنیچر کا دن۔ گہرے سیاہ بادلوں کا آسمان پر ہوا تعاقب کر رہی تھی اور درختوں کی پتیاں زور سے ہل رہی تھیں۔ ہوا سے بارش کی آمد کا احساس ہو رہا تھا۔ دیہاتی علاقہ اسوقت بالکل سنسان تھا۔ کھیتوں میں کہیں کہیں لانبی گھاس ضرور اُگی ہوئی تھی ورنہ ساری زمین کفِ دست کی طرح بالکل صاف تھی۔

راڈل بھوکا تھا ـــــ ایک گرسنہ درندے کی طرح بھوکا، اُسے ایسی وحشیانہ بھوک لگ رہی تھی جو بھیڑیوں کو انسانوں پر حملہ کرنے کے لئے آمادہ کر دیتی ہے۔ تھکن کی وجہ سے وہ جلد جلد چلنے لگا تاکہ راستہ جلد طے ہو جائے اور سُرخ آنکھوں اور خشک منھ کے ساتھ اُس نے اپنی لکڑی اس موہوم اُمید پر اُٹھا لی کہ سب سے پہلے راہرو کو جو راستے میں اپنے مکان کو واپس جاتا ہوا ملیگا اس کو مار کر روٹی چھین لیگا۔

اُس نے سڑک کے کنارے ہل چلائی ہوئی زمین پر اس خیال سے نظر ڈالی کہ کچھ آلو ہی ملجائیں۔ اگر آلو ملجاتے تو وہ لکڑیاں جمع کرتا، کسی گڑھے میں آگ روشن کرتا اور اپنا پیٹ بھر لیتا۔

لیکن یہ ختم سال کا زمانہ تھا اور گزشتہ شام کی طرح اُس کو کچھ کچے ٹنڈے کھانے کو ملے جن کو چلتے چلتے اُس نے کھیت سے اُکھاڑ لیا تھا۔

گزشتہ دو دن سے وہ بہ آواز بلند باتیں کر رہا تھا اور اُس کی رفتار کو اُس کے خیالات کے انہماک نے تیز تر کر دیا تھا اس سے قبل اُسے یہ خیال کبھی نہ آیا تھا کہ جس کام کو اُس نے جی لگا کر اپنی ساری کوششیں صرف کر کے سیکھا تھا۔ محض بیکار تھا اور اب تھکن، تلاش معاش کا دیوانہ وار تعاقب، اور اس کے متعلق کورے جواب، ذلتیں، راتوں کو سبزے پر سو جانا، فاقے، لوگوں کا اُس کے ساتھ نفرت انگیز سلوک، اُن کا متواتر سوال کرنا:۔ "تم اپنے گاؤں میں کیوں نہیں رہتے؟" اپنی قوت بازو سے کام نہ لے سکنے کا رنج، بچھڑے ہوئے والدین کی یاد، کوڑی کوڑی کی محتاجی ـــ یہ سب باتیں آہستہ آہستہ اُس کے دل کو نفرت و غصہ سے معمور کرتی جا رہی تھیں جو ہر روز بلکہ ہر گھنٹہ ہر منٹ بڑھ رہا تھا۔ اور بے اطمینانی کی ایک فریاد مختصر جملے کی صورت میں بلاارادہ اُس کے مُنھ سے نکل جاتی تھی۔

روڑوں سے ٹھوکریں کھاتے ہوئے جو اُس کے برہنہ پاؤں کے نیچے لڑھک رہے تھے وہ چیخ اُٹھا:۔ "مصیبت۔ مصیبت ـــ حرامزادی مصیبت ـــ دو آنے نہیں ملے ـــ دو آنے تک نہیں ملے ـــ اور اب بارش ہو رہی ہے۔

حرامزادی بارش"۔

وہ قدرت کی ناانصافی پر جل رہا تھا اور سارے انسانوں کو بُرا ٹھیرا رہا تھا۔ کیونکہ اندھی فطرت ناانصاف بے رحم اور ظالم ہے۔

"حرامزادی" اُس نے ہلکے بھورے رنگ کے دھوئیں کو چھتوں میں سے نکلتے ہوئے دیکھ کر دانت پیستے ہوئے پھر دہرایا۔ اور سوچنے لگا کہ اُن میں سے کسی ایک مکان میں گھس کر اُس کے رہنے والوں کو مارے اور اُن کی بجائے خود دسترخوان پر جم جائے۔

"مجھے زندہ رہنے کا اب کوئی حق نہیں —" وہ کہنے لگا۔ "جبکہ وہ مجھے بھوکوں مار ڈالنا چاہتے ہیں — اور پھر میں چاہتا کیا ہوں؟ صرف مزدوری کرنا — سور کے بچے! اور اُس کے اعضا کی تکلیف، بھوک کی تکلیف اور دلی اذیت نے ایک اُس قسم کی شوریدہ سری پیدا کر دی جس کا باعث شراب ہوا کرتی ہے۔ اور اُس کے دماغ میں یہ معمولی خیال پیدا ہو گیا کہ:- "مجھے زندہ رہنے کا حق ہے اس لئے کہ میں سانس لیتا ہوں، اس لئے کہ ہوا ہر ایک کے لئے ہے۔ کسی کو مجھے روٹی سے محروم رکھنے کا حق حاصل نہیں۔

مینھ برس رہا تھا، موسلا دھار اور منجمد کرنے والا۔ وہ ٹھیر گیا اور بڑبڑانے لگا:- "ہائے مصیبت — گھر پہونچنے سے پہلے اور ایک مہینہ سڑکوں پر بسر کرنا پڑے گا —" کیونکہ اب وہ اپنے گاؤں کو واپس جا رہا تھا اس خیال سے کہ وہاں کچھ نہ کچھ کام ملجانا آسان تھا — بشرطیکہ وہ ہر اُس کام کو کرنے پر آمادہ ہو جو اُس کو مل جائے۔ بہ نسبت اس کے کہ وہ سڑکوں پر مارا مارا پھرے جہاں ہر شخص اُس کو مشتبہ نظر سے دیکھتا تھا۔

نجاری کا بازار چونکہ سرد تھا اس لئے وہ مزدوری بیلداری یا سنگتراشی کر لیا کرے گا اور اگر اس طرح روزانہ صرف دس آنے مل جایا کریں تو بس گزر کے لئے کافی تھا۔

اُس نے اپنے پھٹے رومال کو گردن پر لپیٹ لیا تاکہ ٹھنڈا اور سرد پانی پشت اور سینے پر نہ ٹپکے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اُس کو احساس ہو گیا کہ کپڑے اندر تک بالکل بھیگ گئے ہیں اور اُس نے حسرت سے اپنے چاروں طرف ایک نظر ڈالی — ایک بے زبان جانور کی سی حسرتناک نظر جو یہ نہ جانتا ہو کہ اپنے جسم یا سر کو کہاں چھپائے اور دنیا میں کہاں پناہ لے۔

رات نے تاریکی میں کھیتوں کو پوشیدہ کر دیا۔ کچھ فاصلے پر ایک مرغزار میں اُسے ایک سیاہ ٹیلہ سا نظر پڑا — گائے! وہ گڑھے پر سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا بغیر کسی خیال کے وہ کر کیا رہا ہے، گائے کی طرف جانے لگا۔

جونہی وہ قریب پہونچا گائے نے اپنا سر اُٹھایا راڈل سوچنے لگا :- "کاش ایک کٹورا ہی ہوتا تو کچھ دودھ پی لیتا"
وہ گائے کو گھور کر دیکھنے لگا اور گائے اُس کو گھورنے لگی - اس کے بعد یکایک اُس نے زور سے ایک لات لگائی اور کہا
"اُٹھ!"، گائے آہستہ آہستہ اُٹھ گئی اور اُس کا وزنی تھن لٹکنے لگا - اِس کے بعد وہ اُس کی ٹانگوں کے درمیان چِت
لیٹ گیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اُس کے گرم اور متعفن تھنوں کو دبا کر بہت دیر تک دودھ پیتا رہا -

لیکن برفیلی بارش اور زور سے ہونے لگی اُسے سردی لگ رہی تھی اور وہ ٹکٹکی باندھے ہوئے اُسی مکان
کو دیکھ رہا تھا جس کے دریچے کی روشنی درختوں میں سے چھَن چھَن کر آ رہی تھی -

گائے پھر دوبارہ بیٹھ چکی تھی - وہ بھی اُس کے نزدیک بیٹھ گیا اور اُس کی دی ہوئی غذا کے شکریہ میں اُس کا
سر سہلانے لگا - شام کی سرد ہوا میں گائے کی کثیف اور بدبودار سانس اُس کے نتھنوں سے اس طرح نکل کر جیسے
دو تلکیوں سے بھاپ نکلے، اس کے منھ پر لگ رہی تھی -

"تجھے تو سردی نہیں لگ رہی ہے"، اُس نے کہا -

پھر وہ اپنے ہاتھ اُس کے سینے اور ٹانگوں پر پھیرنے لگا تاکہ گرم ہو جائیں - پھر اُسے اُس کے گرم پیٹ کے نزدیک
گٹھری بن کر لیٹنے اور رات گزار دینے کا خیال پیدا ہوا - اُس نے جگہ نکال کر اپنا سر اُس کے تھن کے قریب جو ابھی
ابھی خالی ہوا تھا رکھ دیا اور پھر تھک کر چُور چُور ہونے کے باعث اُس کی آنکھ لگ گئی -

کئی مرتبہ وہ پشت یا سینہ اکڑ جانے کی وجہ سے جاگ اُٹھا اور پھر دوسرے حصۂ جسم کو جو ہوا کے رُخ پر تھا
جانور کے جسم سے لگا کر فوراً ہی غافل سو گیا -

مُرغِ سحر کی بانگ نے اُسے بیدار کر دیا - صبح ہو رہی تھی بارش رُک چکی تھی اور مطلع بالکل صاف تھا -
گائے اپنی تھوتھنی زمین پر ٹکائے بیٹھی ہوئی تھی - اُس نے ہاتھوں کے بل جھک کر اس کی چوڑی ناک کا
بوسہ لیا - "خدا حافظ - میری سندری -" اُس نے کہا — "تو بڑی اچھی گائے ہے — خدا حافظ"

اس کے بعد اُس نے پھٹا کوٹ پہنا اور چل کھڑا ہوا -

دو گھنٹے تک وہ سیدھا ایک ہی سڑک پر چلتا رہا - اس کے بعد کچھ ایسا تھک گیا کہ بے اختیار ہو کر گھاس
پر بیٹھ گیا -

اب دن نکل چکا تھا کلیسا کے گھنٹے بج رہے تھے اور عورتیں سفید ٹوپیاں اور مرد نیلا لباس پہنکر پیادہ یا گاڑیوں
میں ہمسایہ گاؤں کی طرف اتوار کا دن اپنے دوستوں یا عزیزوں کے ساتھ گزارنے کے لئے جانے لگے -

ایک موٹا کاشتکار تقریباً بیس بھیڑوں کو جن کی تنظیم اور باقاعدگی ایک تیز قدم کتّے کے ذمہ تھی ہانکتا ہوا چلا جا رہا تھا
راڈل نے اُٹھ کر سلام کیا اور کہا۔ "کیا آپ کے پاس کچھ کام مل سکتا ہے؟ —— ایک ایسے مزدور کے لئے جو بھوکوں مر رہا ہو" اس نے بُری نظروں سے دیکھکر کہا "میرے پاس اُن لوگوں کو جو سڑک پر ملا کرتے ہیں کوئی کام نہیں"۔

نجار پھر دوبارہ سڑک پر بیٹھ گیا۔

وہ بہت دیر تک گاڑی والوں کو دیکھتا رہا کہ کوئی اچھی، مہربان شکل والا نظر آئے تو پھر اُس سے درخواست کرے۔
اُس نے ایک بڑے آدمی کو جو فراک کوٹ پہنے ہوئے تھا اور ایک طلائی زنجیر اُس کے پیٹ پر پڑی ہوئی تھی منتخب کیا۔ اس نے کہا۔ "میں دو ماہ سے روزگار تلاش کر رہا ہوں۔ ابتک کوئی نوکری نہیں ملی اور اب میری جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہیں ہے"۔

مالدار آدمی نے جواب دیا۔ "کیا تم نے وہ اعلان جو اِس ضلع کے حدود پر چسپاں ہے نہیں پڑھا کہ یہاں بھیک کی ممانعت ہے، میں یہاں کا حاکم ہوں اور تم سے کہتا ہوں کہ اگر تم یہاں سے فوراً نہ چلے گئے تو میں تم کو گرفتار کرادونگا۔
راڈل کا ضبط رخصت ہوتا جا رہا تھا اس نے جھلا کر کہا۔ "اگر آپ چاہتے ہیں تو مجھے گرفتار کرلیجیے، کم از کم میں بھوکا تو نہ مروں گا"۔ اور وہ پھر دوبارہ سڑک پر بیٹھ گیا۔

پندرہ منٹ بعد دو پولیس کے سپاہی سڑک پر آتے ہوئے نظر پڑے۔ وہ خراماں خراماں، ساتھ ساتھ آرہے تھے۔ سورج کی کرنیں اُن کی چمکیلی چرمی ٹوپیوں، زرد چہروں اور برنجی کلغیوں پر پڑ رہی تھیں اور وہ ایسے رعب وداب سے چل رہے تھے گویا کہ وہ مجرموں کو ڈرانے اور اُن کو خوفزدہ کرکے بھگا دینے کے لئے آرہے ہیں۔

نجار سمجھ گیا کہ وہ اُس کے لئے آرہے ہیں لیکن وہ اُسی طرح خاموش بیٹھا رہا۔ اُس کو اُن کا مقابلہ کرنے کی خواہش پیدا ہوئی تاکہ وہ گرفتار کرلیں۔ اپنا بدلہ وہ بعد میں لیتا رہے گا۔

اپنے خاص فوجی انداز سے بے ڈھنگے قدم رکھتے ہوئے —— بطخ کی طرح —— وہ اس طرح چلے آرہے تھے گویا کہ اُنھوں نے اُس کو دیکھا ہی نہیں ہے۔ پھر یکایک اُس کے قریب سے گزرتے ہوئے اُنھوں نے اُس کو دیکھا، ٹھٹکے، اور اُس کو دھمکی دینے والی پُرخشونت آنکھوں سے گھورنے لگے۔ سارجنٹ پوچھتا ہوا آگے بڑھا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"سستا رہا ہوں" اُس نے خاموشی سے جواب دیا۔

"تم کہاں سے رہے ہو؟"

"اگر میں تم کو اُن سارے مقامات کے نام بتلاؤں جہاں جہاں سے میرا گزر ہوا ہے تو کامل ایک گھنٹہ لگ جائیگا۔"

"جاؤ گے کس جگہ؟"

"ولیاوری کو"

"وہ کہاں ہے؟"

"مانشی میں"

"کیا وہ تمہارا وطن ہے؟"

"ہاں"۔

"تم نے اُس کو چھوڑا کیوں تھا؟"

"تلاش معاش کی خاطر"

سارجنٹ کانسٹبل کی طرف مڑا اور اُس شخص کے لہجے میں، جو ایک ہی قسم کی جھوٹی بات متعدد مرتبہ سُنکر بھڑک اُٹھا ہو، چلّایا:-

"سب بدمعاش یہی کہتے ہیں۔ لیکن میں اُن کی چالوں کو سمجھتا ہوں۔"

اس کے بعد اُس نے پوچھا:-

"تمہارے پاس کچھ کاغذات ہیں؟"

"ہاں۔"

"مجھے دکھاؤ۔"

راڈل نے اپنی جیب سے کاغذات نکالے ـــ سارٹیفکٹ، میلے، بوسیدہ، پھٹے پُرانے کاغذات، اور اُن کو افسر کے حوالے کر دیا۔

دوسرے نے اٹک اٹک کر پس و پیش کرتے ہوئے، ہجے کر کے پڑھا اور ساتھ ہی اُنکو ٹھیک ظاہر کرتے ہوئے جھنجھلا کر اس طرح واپس کر دیا جیسے کسی شخص کو اُس سے زیادہ مکّار آدمی نے دھوکا دیا ہو۔

چند منٹ غور کرنے کے بعد اُس نے پھر اپنی تفتیش شروع کر دی:-

"تمہارے پاس کچھ رقم ہے؟"

"نہیں"

"کچھ بھی نہیں"۔
"ایک پیسہ نہیں؟"
"ایک پیسہ نہیں"
"پھر تمھاری گزر کیسے ہو رہی ہے؟"
"جو کچھ مل جاتا ہے اُس پر"۔
"تو تم بھیک مانگتے ہو؟"
"ہاں جب ضرورت پڑے"۔ راڈل نے بغیر کسی جھجک کے جواب دیا۔
لیکن سپاہی نے کہا:۔ "میں تم کو آوارہ گردی اور شاہراہ عام پر بھیک مانگنے کی "علت" میں گرفتار کرتا ہوں۔ کیونکہ نہ تو تمھارا گھر ہے اور نہ کوئی وجہ معاش۔ اور تم کو اپنے ہمراہ چلنے کا حکم دیتا ہوں"۔
نجار اُٹھ کھڑا ہوا۔
"جہاں چاہو لے چلو"۔ اُس نے کہا اور اپنے آپ کو دونوں افسروں کے درمیان کر کے، گو انھوں نے ابھی اس کا حکم نہ دیا، اُس نے اپنی بات اس طرح پوری کر دی:۔
"چلو مجھے قید کر دو۔ جب بارش ہوگی تو سر چھپانے کا تو آسرا رہے گا"۔
وہ گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے جس کے مکانوں کی چھتیں پون میل کے فاصلے سے بے برگ اشجار میں سے نظر آ رہی تھیں۔

جب وہ گاؤں میں سے گزر رہے تھے تو نماز کا وقت تھا۔ چوک آدمیوں سے پُر تھا۔ فوراً ہی ان کی دو قطاریں مجرم کو جاتا دیکھنے کے لئے بن گئیں جس کے ساتھ شریر لڑکوں کی ایک پوری فوج تھی۔ مرد اور عورت سب قیدی کو نفرت کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ وہ اُسکو سنگسار کر دینا چاہتے تھے، اُس کی کھال کو ناخنوں سے نوچ نوچ کر اُس کو قدموں سے کچل ڈالنا چاہتے تھے۔ اُن کو حیرت تھی کہ آیا وہ چور ہے یا کوئی قاتل۔ قصاب جو ایک پُرانا تجربہ کار سپاہی تھا کہنے لگا:۔ "وہ زانی ہے"۔ تمباکو فروش کا خیال تھا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے اُسے ایک کھوٹی چونّی دی تھی۔ اور لوہار کو یقین تھا کہ بیوہ مالٹ کا لاپتہ قاتل جس کی تلاش پولیس چھ ماہ سے کر رہی تھی یہی تھا۔
میونسپل کونسل روم میں جہاں کہ پولیس والے اُسے لائے تھے راڈل نے حاکم کو اجلاس پر اور اُس کے پہلو میں مدرس کو بیٹھے دیکھا۔

مجسٹریٹ نے کہا:۔ "آہا، آخر تم آگئے۔ میں نے کہا تھا کہ تم کو قید کر دیا جائیگا۔ اچھا سارجنٹ واقعہ کیا ہے؟"

سارجنٹ بولا:۔ "ایک آوارہ گرد جس کا نہ کوئی ٹھکانہ ہے اور نہ ظاہری اسباب گزر اوقات۔ اُس کو اپنے بیان کے مطابق آوارہ گردی اور بھیک مانگنے کی علت میں گرفتار کیا گیا ہے۔ اُس کے پاس سارٹیفکٹ اچھی حالت میں موجود ہیں"۔

مجسٹریٹ نے کہا:۔ "مجھے کاغذات دکھاؤ"۔ اُن کو اُس نے لے لیا، پڑھا، پھر دوبارہ پڑھا۔ اور واپس کرتے ہوئے حکم دیا:۔ "اس کی تلاشی لو"۔ راڈل کی تلاشی لی گئی۔ کچھ بھی برآمد نہ ہوا۔

"آج صبح کو تم سڑک پر کیا کر رہے تھے؟" اُس نے مزدور سے دریافت کیا۔

"میں کام کی تلاش میں تھا"۔

"کام کی تلاش ——— شاہراہ عام پر؟"

"تو پھر کیا جنگل میں چھپ کر تلاش کرنے سے مجھے کام مل جاتا؟"

دونوں ایک دوسرے کو دو مختلف النسل درندوں کی حریفانہ نفرت سے گھورنے لگے۔

مجسٹریٹ نے کہا:۔ "اب تو میں تمھیں چھوڑے دیتا ہوں لیکن پھر دوبارہ ایسی حرکت نہ کرنا"۔

"آپ قید ہی کر دیں تو بہتر ہے"۔ نجار نے جواب دیا۔ "میں سڑکوں پر بہت کافی گھوم چکا"۔

"خاموش!" حاکم نے درشتی سے کہا۔

اس کے بعد اُس نے پولیس والوں کو حکم دیا:۔ "اس کو گاؤں سے دو میل کے فاصلہ پر لیجا کر چھوڑ دو"۔

"کم از کم مجھے کھانے کو تو کچھ دیجئے"۔ مزدور نے کہا۔

وہ غضبناک ہو گیا:۔ "کھانا کھلایا جائے! یہی تو باقی رہ گیا ہے۔ آہا! ہا! ہا! خوب!"

لیکن راڈل بغیر کسی جھجک کے کہتا رہا:۔ "مجھے بھوکوں مرنے کے لئے چھوڑنا گویا جرم کا ارتکاب کرنے پر مجبور کرنا ہے اور یہ تم بڑے بڑے توند والوں کے لئے اچھا نہ ثابت ہوگا"۔

مجسٹریٹ کھڑا ہو گیا تھا اُس نے اپنا حکم دہرایا:۔ "اس کو یہاں سے جلد لیجاؤ۔ ورنہ مجھے غصہ آجائے گا"۔

دونوں پولیس والوں نے نجار کے بازو پکڑے اور روانہ ہو گئے۔ اُس نے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی۔ گاؤں سے نکل کر پھر ایک مرتبہ اُس نے اپنے آپ کو اُسی سڑک پر پایا۔ پولیس والے اُس کو دو میل تک لے گئے اور وہاں پہونچکر سارجنٹ نے کہا:۔

"چل رفوچکر ہو جا ـــــ اِس علاقے میں پھر قدم نہ رکھنا ورنہ میں پھر ٹھیک کر دوں گا۔"

راڈل جواب دئے بغیر اور اس سے بیخبر کہ وہ کہاں جا رہا ہے چل کھڑا ہوا۔ وہ سید ہا پندرہ یا بیس منٹ تک کچھ ایسی بدحواسی کے عالم میں چلتا رہا کہ کچھ سوچ ہی نہ سکتا تھا۔

لیکن یکایک جب وہ ایک چھوٹے سے مکان کے قریب سے جس کا نصف دریچہ کھلا ہوا تھا گزرا تو قورمہ کی مہک نے اُس کو کشاں کشاں دروازے کے سامنے لا کھڑا کیا۔

بھوک، حریصانہ، وحشیانہ اور دیوانہ کر دینے والی بھوک نے اس کے حواس سلب کر لئے۔

"خدایا اکی دفعہ اُن کو کچھ نہ کچھ دینا" پڑیگا" اُس نے زور سے فریاد کناں لہجے میں کہا اور دروازے کو اپنی چھڑی سے کھٹ کھٹایا۔

کسی نے جواب نہ دیا۔ اُس نے چیختے ہوئے زور سے کھٹ کھٹایا: "ارے کوئی ہے؟ دروازہ کھولو!"

اندر سے کوئی آواز نہ آئی۔ اُس نے دریچے کے پاس جاکر اُس کو اپنے ہاتھ سے ڈھکیلا اور باورچی خانے کی مقید ہوا، گرم گرم قورمے اور گوبھی کی مہک باہر آنے لگی۔

ایک چھلانگ میں بخار کمرے کے اندر تھا۔ میز پر دو نشستیں تھیں۔ مکان والے اپنے کھانوں کو چولہے پر رکھ کر نماز کے لئے گئے ہوئے تھے۔ شراب کی دو بوتلوں کے درمیان روٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔

راڈل نے پہلے روٹیوں پر حملہ کیا اور اس بے رحمی سے اُن کو توڑنے لگا گویا کہ کسی آدمی کا ٹیٹوا دبا رہا ہے۔ اس کے بعد وہ حریصانہ بڑے بڑے لقمے بنا کر کھانے لگا۔ لیکن فوراً ہی اُسے گوشت کی خوشبو چولہے کی طرف لیگئی اور اُس نے دیگچی پر سے تھالی اُٹھا کر کانٹے کو جلدی سے اندر ڈالا اور گوشت کا ایک بڑا ٹکڑا نکالا۔ اس کے بعد اُس نے گوبھی، گاجر اور پیاز سے رکابی بھرلی اور اُس کو میز پر رکھ کر خود بیٹھ گیا۔ گوشت کے چار ٹکڑے کئے اور اس طرح کھانے لگا گویا اپنا ہی گھر ہے۔ جب اُس نے تقریباً سارا گوشت اور ترکاری کی کافی مقدار چپٹ کر دی تو اُس کو تشنگی محسوس ہوئی اور وہ اُٹھ کر چولہے کے قریب سے ایک بوتل اُٹھا لایا۔

جونہی اُس نے شراب کو اپنے جام میں دیکھا اُس نے تاڑ لیا کہ برانڈی ہے ـــــ شراب گرم ـــــ اُسکی رگ رگ میں آگ لگا دینے والی اسقدر سردی سہنے کے بعد یہ چیز اچھی رہی ـــــ اور وہ پینے لگا۔

چونکہ مدت سے اُس نے نہیں پی تھی اس لئے وہ اُس کو بہت اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ دوسرا جام اُس نے بھرا اور دو گھونٹ میں چڑھا گیا۔ یکایک اُس کے چہرے پر رونق آگئی۔

وہ کھاتا رہا لیکن نسبتاً کم تیزی سے، چبا چبا کر اور روٹی کو شوربے میں تر کر کے۔ اُس کا سارا جسم خاص کر پیشانی جہاں خون کی روانی بہت تیز ہوگئی تھی، نہایت گرم تھی۔ یکایک فاصلے پر گھنٹے بجنے لگے، نماز ختم ہو رہی تھی۔ نجّار دفعتاً کھڑا ہوگیا اور بچی ہوئی روٹی کو ایک جیب میں اور برانڈی کی بوتل کو دوسری میں رکھ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا دریچے کے پاس گیا اور باہر سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔

سڑک پر اب بھی سناٹا تھا۔ وہ چھلانگ مار کر باہر نکل گیا اور اپنی راہ ہولیا۔ لیکن بجائے شاہراہ عام پر جانے کے وہ کھیتوں میں سے جنگل کی سمت بھاگنے لگا۔

وہ مستعد، قوی اور بشاش معلوم ہو رہا تھا۔ اب وہ ایسا پھرتیلا ہوگیا تھا کہ کھیتوں کی درمیانی باڑھ سے دونوں پاؤں ملا کر ایک چھلانگ میں کود گیا۔

جونہی وہ درختوں کے نیچے پہونچا اُس نے جیب سے بوتل نکالی اور چلتے چلتے پینے لگا۔ اس کے بعد اُس کے خیالات پریشان ہوگئے۔ آنکھوں کے سامنے دھند لکا سا آگیا اور اُس کی ٹانگیں ایسی لچکیلی ہوگئیں جیسے کمانی۔

اب وہ خنک اور ترکائی پر چل رہا تھا اور اس فرشِ مخملی کو دیکھ کر ایک بچے کی طرح بے اختیارانہ اُس کا دل کودنے کو چاہنے لگا۔ اُس نے ایک دوڑ لگائی، سر نیچے اور پاؤں اوپر کر دئے، اُچھل کر کھڑا ہوگیا اور پھر اُسی طرح قلابازیاں لگانے لگا۔

یکایک اُس نے اپنے آپ کو ایک تنگ گلی میں پایا اور ایک ماما کو دیکھا جو اپنے ہاتھوں میں دو برتن دودھ سے لبریز لئے ہوئے گاؤں کو واپس جا رہی تھی۔

وہ آگے کی طرف جھکا ہوا اُس کو گھورنے لگا اور اُس کی آنکھیں کتے کی طرح جسنے اپنا شکار دیکھ لیا ہو، چمکنے لگیں۔ ماما کی بھی اُس پر نظر پڑی، اُس نے سر اُٹھایا، کھِل کھِلا کر ہنس پڑی اور پکار کر کہنے لگی:۔ "کیا تم گا رہے تھے؟"

اُس نے کچھ جواب نہ دیا اور نالے میں کود پڑا اگرچہ اُس کا کنارا چھ فٹ بلند تھا۔

"اللہ! تم نے تو مجھے ڈرا دیا!" یکایک اُس کو اپنے سامنے کھڑا ہوا دیکھ کر ماما نے کہا۔

لیکن اُس نے اُس کی بات مطلق نہ سُنی۔ وہ پئے ہوئے تھا۔ اُس کے حواس ایک جذبہ نے جو بھوک سے بدرجہا زیادہ تکلیف دہ تھا سلب کر لئے تھے۔ شراب اور ایک بے قابو کر دینے والی خواہش نے اُس شخص کی طرح جو دو مہینے سے لذاتِ دنیوی سے محروم کر دیا گیا ہو، جو مدہوش ہو، نوجوان ہو، پر جوش ہو، اور جس کے جسم میں فطرت کی پیدا کی ہوئی تمام خواہشات نے آگ لگا رکھی ہو، اُس کو پاگل بنا دیا۔

لڑکی اُس کی صورت، اُس کی آنکھوں، اُس کے نصف کھُلے ہوئے مُنھ اور اُس کے پھیلے بازوؤں سے خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹی۔

راڈل نے اُس کے بازو پکڑ لئے اور ایک لفظ کہے بغیر، اُس کو سڑک پر ڈال دیا۔ برتن اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا پڑے۔ اس کے بعد وہ چیخنے لگی۔ پھر یہ دیکھ کر کہ اُس سنسان مقام پر چیخنا لاحاصل ہے اور اب اچھی طرح یہ سمجھ جانے کے بعد کہ وہ اُسکی زندگی کا درپے نہیں، اُس نے اپنی نارضامندی کا کچھ زیادہ اظہار نہیں کیا۔

جب وہ اُٹھی تو گرے ہوئے برتنوں کے خیال سے یکایک اُسے غصہ آگیا اور اپنے پاؤں سے کھڑاؤں اُتار کر اُس کی طرف جھپٹی کہ اگر وہ دودھ کے پیسے نہ دے تو مار مار کر اُس کا بھُرکس نکال دے۔

لیکن راڈل —— جس کا نشہ اب ہرن ہو چکا تھا اور اپنے کئے پر بے انتہا خوفزدہ تھا، اُس کے حملے کی اصلی غایت کو نہ سمجھ کر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ اور وہ پتھر پھینکنے لگی جس میں سے چند اُسکی پُشت پر لگے۔

وہ بہت دیر تک بھاگتا رہا۔ اس کے بعد اُسے کچھ ایسی تھکن محسوس ہونے لگی جو اُسے زندگی بھر نہ ہوئی تھی اُس کی ٹانگیں کمزور ہو گئیں اور سر گھومنے لگا۔ جو کچھ گزر چکا تھا سب اُس کے دماغ سے محو ہو گیا اور کچھ سوچنے اور غور کرنے کے قابل نہ رہا۔

وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔

پانچ منٹ بعد وہ غافل سو رہا تھا۔

وہ چونک کر جاگ اُٹھا۔ اور آنکھیں ملتے ہوئے اُس نے دو چمکیلی چرمی ٹوپیوں والے آدمیوں کو اپنے اوپر جھُکا ہوا اور پکڑ کر مشکیں باندھتے ہوئے دیکھا۔

"میں جانتا تھا کہ تم کو دوبارہ گرفتار کرنا پڑے گا" سارجنٹ نے طنز سے کہا۔

راڈل نے کوئی جواب نہ دیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ پولیس والوں نے اُس کو جھنجوڑا اور اگر وہ صدائے احتجاج بلند کرتا تو وہ سختی کا سلوک کرنے کو تیار تھے کیونکہ اب وہ اُن کا شکار تھا —— اچھا شکار —— اِن مخبروں کے شکاریوں کا کیا ہوا قیدخانے کا شکار، جس کو وہ دوبارہ نہیں چھوڑنے والے تھے۔

"چلو!" سارجنٹ نے حکم دیا۔

سب روانہ ہو گئے۔ شام ہو رہی تھی۔ موسم خزاں کی اُداس اور نامبارک شفق حدِ نظر تک پھیل چکی تھی۔

آدھے گھنٹہ میں وہ گاؤں پہونچ گئے۔

ہر گھر کا دروازہ کھُلا ہوا تھا کیونکہ جو کچھ ہوا تھا اُس سے ہر شخص واقعت تھا اور سب اُس بدبخت کو دیکھنے کے لئے بے چین تھے تاکہ اُس پر گالیوں کی بوچھار کی جا سکے۔

ہنگامۂ شور و غل پہلے مکان سے شروع ہو کر ٹاؤن ہال کے پاس ختم ہوا جہاں حاکم بھی اس آوارہ گرد سے اپنا بدلہ لینے کے لئے منتظر بیٹھا تھا۔

جونہی اُس کی نظر راڈل پر پڑی وہ دور ہی سے چلایا:۔

"آہا! تم آ گئے؟"

اور فرطِ مسرت سے اپنے ہاتھ ملنے لگا۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا" اُس نے کہا "صرف سڑک پر دیکھ کر میں سمجھ چکا تھا"

اور اپنی بات پوری کرتے ہوئے اُس نے اور زیادہ مسرت سے کہا:۔

"تجھے حبسِ دوام کی سزا دی جائے گی۔ بدمعاشس!"

(موپاساں)

سید محمد احسن بی۔ اے

بہار

مؤلفہٗ الیاس احمد ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی منصف سہارنپور

"گلدستۂ بہار" فارسی اور اُردو شعرا کے کلام کا بہترین اور نایاب مجموعہ ہے۔ اس گلدستہ کے ہوتے ہوئے کسی کے دیوان کی ضرورت نہیں ہے چیدہ چیدہ متحد المضامین اشعار ایک خاص سرخی کے تحت میں درج ہیں۔ سرخیاں سیکڑوں ہیں۔ علم و ادب میں گلدستۂ بہار ایک دلکش اور دلفریب اضافہ ہے۔ کتاب دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ مصرع۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ اہل ذوق ملاحظہ فرمائیں۔ ضخامت ۲۲۶ صفحے قیمت معہ محصولڈاک عہ ۸/

ملنے کا پتہ:۔ منیجر صاحب دارالمصنفین اعظم گڈھ

مکتوبات نیاز

عزیز گرامی۔

یہ درست ہے کہ شیوۂ محبت کا واقف آپ سے زیادہ کون ہو سکتا ہے، لیکن خدارا، یہ تو بتائیے کہ آپ کے یہاں "جُرمِ محبت" بھی کوئی چیز ہے یا نہیں۔ ہاں، ہاں، کہہ دیجئے کہ آپ کی معصوم دنیا میں اس کا کیا گزر۔

مہینوں گزر جائیں آپ میری بات نہ پوچھیں۔ یہ عینِ اُلفت! میں آپ کی تمام بے اعتنائیوں کے باوجود رات دن آپ ہی کا دم بھرتا رہوں، یہ سراسر جُرمِ محبت!

خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

بیس دن ہوئے آپ کو میں نے ایک نہایت ضروری خط لکھ کر چند باتیں دریافت کیں، اس کے بعد متواتر دو بار یاددہانی کی، لیکن نہ آپ نے میرے اضطرار کی پرواہ کی اور نہ اس امر کی کہ آپ اگر ذرا توجہ کر کے اُن اُمور کے متعلق تفصیلی حالات لکھ دیتے تو میرا کتنا فائدہ تھا۔ بہر حال اب کہ وقت گزر گیا ہے، یہ شکایت بالکل بیکار ہے کیونکہ اگر آپ اب جواب بھی دیں تو کوئی نتیجہ نہیں لیکن اس خیال سے کہ شاید آپ کو میرا دل توڑ کر، میرا نقصان کر کے کچھ مسرت ہو، یہ اطلاع دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ بحمد اللہ ان دونوں باتوں میں کامیاب ہو گئے اور جو کام آپ نے کیا ہے وہ شاید ہی رستم و اسفندیار سے ہو سکتا۔

شاید آپ اس تحریر کا جواب دیں، لیکن یہ سمجھ لیجئے کہ اب میرا دورِ سکوت و پندار شروع ہو گیا ہے۔ اس کے بعد بھی آپ جرأتِ خطاب کریں تو آپ جانئے۔

صاحب الطاف عمیم۔ القاب و آداب کا یہ اہتمام صرف اس لئے ہے کہ آپ چاپلوسی کے فریب میں آجائیں اور میری خطا کو درگزر فرما دیں۔ باور کیجئے میں حد درجہ نادم ہوں کہ آپ نے ساری عمر میں ایک خدمت میرے سپرد

فرمائی اور وہ بھی مجھ سے بروقت انجام نہ پا سکی۔ مصروفیت وغیرہ کا عذر تو خیر بالکل لایعنی سی بات ہے، لیکن یہ بالکل صحیح ہے کہ باوجود کوشش کے بھی اس طرف طبیعت مایل نہ ہوئی۔ میں چاہتا تھا کہ مسودہ کو اسی کیفیت کے ساتھ دیکھوں جس کے ماتحت آپ نے لکھا ہے، لیکن افسوس ہے کہ اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ آخرکار مجبوراً آورد و تصنع سے کام لینا پڑا اور اب انتہائی شرمندگی کے ساتھ اُسے واپس کر رہا ہوں —— غالباً آپ کو اطمینان نہ ہوگا لیکن مجھے اس حد تک ضرور اطمینان ہے کہ زبان و لغت کی غلطی تو اب کوئی ہے نہیں۔ رہ گیا سوال بیان و معانی کا، سو اس کی پرواہ نہ کیجئے کہ لوگوں نے ملہمات ربانی کو بھی مجروح کئے بغیر نہیں چھوڑا، اور کسی تصنیف کا کیا ذکر ہے۔

جو کچھ میں لکھ رہا ہوں، خدا کرے آپ کو اس کا یقین ہو جائے اور اس کا یقین مجھے صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ آپ اس کے جواب میں پروانۂ معافی بھیج دیں۔ اس خط کو کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ڈاک میں ڈال رہا ہوں اور اس کے جواب کو اس سے بھی زیادہ لرزاں ہاتھوں سے کھولوں گا۔

واللہ، آپ بھی قیامت کرتے ہیں، کہ میرا "پائے لنگ" چھین کر "دلِ تنگ" مرحمت فرمانا چاہتے ہیں۔

آپ کی چارہ سازیوں کا شکریہ، لیکن میرا اُن سے فائدہ اُٹھانا معلوم! یقیناً آپ کو میری بیکسی و بیچارگی پر رحم آنا چاہئے، لیکن باور کیجئے کہ میں رحم کے قابل نہیں ہوں اور اتنا خانماں برباد نہیں جتنا آپ سمجھتے ہیں۔

عشق ہر جا می رود ما را بہ ساماں می برد

فرق اگر ہے تو صرف اتنا کہ آپ کے یہاں زندگی نام ہے مرغ و ماہی کا، دیبا و حریر کا، خدم و حشم کا، ایوان و قصور کا، مے و نغمہ کا۔ یہاں "برگ و ساز" عبارت ہے صرف اس فلسفہ سے کہ

رخت اگر کمتر بود کشتی بہ ساحل می برند

آپ کو اپنی اہمیت کا علم اس طرح ہوا کہ دوسرے ایسا کہتے ہیں، اور میری غیر اہمیت مجھ پر اس طرح القا ہوئی

مرا کردہ اند آشکارا بہ من

اللہ اللہ کیجئے۔ آپ بھی کس فکر میں مبتلا ہو گئے —— آپ کیوں دیوانوں کا ساتھ دے کر اپنی زندگی کا لطف ضایع کرتے ہیں

بادلشدگاں ہر کہ در افتاد بر افتاد

محبِ دلنواز، آپ کا پیام، اختر کے ذریعہ سے پہونچا، مجھے تعمیل ارشاد میں کیا عذر ہو سکتا ہے، مگر سوچ لیجئے کہیں ایسا نہ ہو اس کا نتیجہ خلاف اُمید نکلے! میرا تو اس میں کوئی نقصان نہیں جاتا ہے اور سچ سچ سارا واقعہ عرض کر دینا ہے، لیکن اگر انھوں نے صرف اسوجہ سے باور نہ کیا کہ روایت کرنے والا میں ہوں تو پھر کیا ہوگا - آپ کو معلوم نہیں، میں ہمیشہ سے ان کے نزدیک مجروح راوی کی حیثیت رکھتا ہوں، یہاں تک کہ اگر میں کہدوں خدا ایک ہے تو انھیں توحید میں بھی شک پڑ جائے گا، پھر کیوں نہ یہ خدمت آپ مولانا ذاکر کے سپرد فرمائیں جو اُن کے نزدیک مخبرِ صادق کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ آپ کہیں گے ان پر اعتبار مشکل ہے، سو اس کی ترکیب یہ ہے کہ مجنوں صاحب کو بھی ان کی معیت میں بھیجدیجئے۔

بہرحال مجھے امتثالِ امر میں عذر نہیں، لیکن کیا فائدہ اگر نتیجہ خاطر خواہ نہ نکلا - جواب کا منتظر ہوں۔

نگاہِ اولیں اور اس درجہ گرم و ستیزہ کار! معاذ اللہ! لیکن شاید آپ کو معلوم نہیں کہ ان نشتروں کی خلش مجھے کس حد تک گوارا ہے۔

آپ "بہ اندازہ بنوش" کی ہدایت فرماتے ہیں اور یہاں یہ عالم ہے کہ

تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر
بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

آپ مجھے "کل" سے کیوں ڈراتے ہیں، جبکہ میں آج ہی سب کچھ آپ کے "پندار" پر قربان کر چکا ہوں۔ خدا وہ دن تو کرے کہ آپ اس ساز و سامان سے مجھے تباہ کرنے کے لئے تشریف لائیں۔

اے سنگ بر تو دعوئے طاقت مسلم ست
خود را ندیدۂ بہ کفِ شیشہ گر ہنوز

محمود صاحب سے کہدیجئے کہ انھوں نے لکھنؤ میں مجھے اسی چیز سے محروم رکھا جو میرا تنہا سرمایۂ حیات ہے، اور پھر اُس پر آپ کا یہ ظلم کہ مجھی سے اس کا ذکر بھی کیا جاتا ہے - ہاں صاحب، چھایا کا خیال سنئے، ساون کی الاپ پر سر دھنئے، ہولیاں کھیلئے، رنگ رلیاں منائیے، یہاں کیا ہے، وہی ایک داغِ نارسائی یا پھر

دستے کہ بجز جامہ دریدن نہ شناسد!

پیرو مرشد، یہ کیا خیال ذہن مبارک میں آیا؟ میں اور آپ سے سرتابی! ذرہ و آفتاب کی دنیا میں یہ بات تو کبھی نہیں سنی گئی۔ کاہ و کاہربا کی حکایت میں یہ واقعہ تو آج تک کسی نے بیان نہیں کیا!

آپ کی محبت میرا ایمان اور آپ کا آستانہ میرا کعبۂ ایقان ہے، پھر

اے دامن تو قبلۂ مشتِ غبار من

یہ آپ نے کیونکر باور کر لیا کہ میں آپ سے منحرف ہو کر زندہ رہ سکتا ہوں۔ مجھے اس سے زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں، آپ خود روشن ضمیر ہیں اور اچھی طرح جانتے ہیں کہ

در کوئے یار بندۂ فرمانبرم ہنوز

سوزاں چو شمع بودن، دانی کہ می توانم

داغ از دلم زدودن، دانی کہ می توانی؟

یعنی بجائے خود یہ حقیقت تو مسلم ہے کہ میں آپ سے کبھی بے تعلق نہیں ہو سکتا، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا آپ کو بھی اس کا علم ہے یا نہیں؟ کہہ دیجئے، کیوں نہیں؟ اور پھر اس کے بعد خاموشی اختیار کر لیجئے یہاں تک کہ آہ و فریاد کی تمام طاقت مجھ سے سلب ہو جائے۔ پے در پے چار عریضے روانہ کئے لیکن کوئی اعتنا نہیں، دو تار بھیجے، مطلق پرواہ نہیں، خاص طور پر آدمی بھیجا مگر جواب ندارد۔ اس بے توجہی سے تو خدا کی خدائی بھی نہیں چل سکتی، کارگاہِ "عشق و جمال" کا کیا ذکر ہے! آپ کہیں گے کہ یہ سب جھوٹ ہے، نہ اس سے پہلے کوئی خط آپ کو ملا نہ تار، نہ کوئی آدمی پہونچا نہ تقاضہ یہ سب درست سہی، لیکن میں تو مستقبل کا ذکر کر رہا ہوں اور جانتا ہوں کہ یہ سب کچھ ہو کر رہیگا۔ اس لئے اس کی تکذیب کی صورت اگر ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ آپ فوراً جواب دیں اور نصیر کی روانگی کی تاریخ وہیں سے متعین کر کے اس بار سے مجھے سبکدوش فرمائیں۔ اُن کے حقوق آپ پر بھی اتنے ہی ہیں جتنے مجھ پر، اور پھر آپ مجھ سے زیادہ دردمند دل رکھنے کے مدعی بھی ہیں، اس لئے معاملہ احسان و مراعات کا نہیں بلکہ ادائے فرض و رعایتِ فطرت کا ہے، جسے آپ مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔

کل ایک صاحب تشریف لائے اور تمہارے متعلق عجیب و غریب خبر سُنائی، وہ یہ کہ تم نے اپنی بیوی کو

طلاق دیدی ہے اور دوسری شادی کرنے والے ہو۔ پھر اگر معاملہ صرف طلاق کا ہوتا تو بھی غنیمت تھا۔ لیکن یہ عقد ثانی کی ترکیب بالکل سمجھ میں نہ آئی۔ میں تمہاری طوفانی طبیعت سے واقف ہوں اور جانتا ہوں کہ جذبات سے مغلوب ہو کر تم اس سے بھی زیادہ نازیبا حرکت کے مرتکب ہو سکتے ہو، لیکن اس سے بھی آگاہ ہوں کہ جب جنوں دور ہو جاتا ہے تو فرشتہ بھی تمہارے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ اول تو خدا کرے تم اس خبر کی تردید کر دو، لیکن اگر خدانخواستہ یہ واقعہ صحیح ہے تو اطلاع دو تاکہ دل کھول کر تمھیں گالیاں دے سکوں۔

ہر چند یہ تمہاری زندگی کا کوئی نیا تجربہ نہیں اور اسوقت تک تم کئی بار اپنے مسلمان ہونے کا ثبوت اس طرح دے چکے ہو، لیکن خیر ہر بار کوئی نہ کوئی معقول سبب تمہاری خوش قسمتی سے پیدا ہو جاتا تھا، اس مرتبہ تو کوئی تاویل ہو ہی نہیں سکتی، سوائے اس کے کہ تم دفعتہً انسان سے جانور بن گئے ہو۔ بہر حال مجھے سخت خلجان ہے اور اگر تمہارا ہیجان دور ہو گیا ہو تو مفصل حالات سے آگاہ کرو، ورنہ میں خود آتا ہوں اور صرف اس لئے کہ اگر تم دوسری شادی کر چکے ہو تو اس کو بھی طلاق دلواؤں، کیونکہ ایک نہ ایک دن اس کے ساتھ بھی یہی سلوک ہونا ہے۔

صدیقی الاجل - میں کل شام کو یہاں پہونچا اور اس وقت تک کہ کامل ۲۰ گھنٹے گزر گئے ہیں یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ اگر یہ لوگ واقعی انسان ہیں تو میں اپنے آپ کو کس قسم کا حیوان سمجھوں - اس میں کلام نہیں کہ "مساوات" عمدہ چیز ہے لیکن صرف "نظریہ" کی حد تک، کیونکہ اگر عملی صورت میں اس کا مظاہرہ اس طرح ہو سکتا ہے جو یہاں نظر آیا تو "ڈماکریسی" اور جمہوریت دونوں پر لعنت ہے۔

مجھے ایسے آقا کی ضرورت نہیں جو اپنی طرح مجھے بھی حیوان سمجھ کر زر و سیم کے انبار سے لاد دے، مجھے تو ایسا مالک چاہئے جو مجھے فاقوں میں مبتلا کرے لیکن سمجھے انسان ــــ باور کرو میں یہاں ایک منٹ کے لئے --- نہیں رہ سکتا اور شام تک میرا یہاں سے بھاگ جانا بالکل برحق ہے۔

میرے اس خط کا جواب اس وقت دینا جب میں پھر تمھیں لکھوں۔ لاحول ولا قوۃ، تم نے بھی کس عذاب میں مبتلا کر دیا۔

مکتوبات نیاز

رعایتی قیمت میں وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں جو عاً پیشگی بھیجدیں گے۔ محض پیشگی نام لکھا لینا مفید نہیں ہو سکتا۔ منیجر نگار لکھنؤ

مصطفیٰ کمال کی زندگی کے چند دلچسپ اوراق

یوں تو اسوقت روئے زمین پر متعدد ہستیاں ایسی ہیں جو صرف اپنی ذاتی کوشش کی بدولت جھونپڑے سے محلوں تک پہونچی ہیں۔ مثلاً اطالیہ کا مسولینی، جرمنی کا ہر ہٹلر، ایران کا رضا شاہ لیکن یہ واقعہ ہے کہ زندگی کی جن تلخ و پیچیدہ راہوں سے مصطفیٰ کمال کو گزرنا پڑا ہے، اُن سے کوئی دوچار نہیں ہوا۔ دنیا کی کوئی سخت سی سخت مصیبت ایسی نہ تھی جو اس پر نازل نہ ہوئی ہو اور ہوش سنبھالنے کے بعد شاید ہی کوئی سال اس پر ایسا گزرا ہو کہ آگ اور خون کا کھیل کھیلنے پر وہ مجبور نہ ہوا ہو، لیکن اس کے آہنی اعصاب ہر شدید ضرب کے بعد ہمیشہ اور زیادہ سخت ہوتے گئے اور کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی اسنے مایوسی و ناکامی سے اپنے آپ کو مغلوب ہونے نہیں دیا۔ دوستوں نے اس کے ساتھ دشمنی کی، اعزہ نے اس کی مخالفت کی، حکومت نے اس کو باغی سمجھا، ارباب وطن نے اس کی خدمات کو ٹھکرایا، لیکن ملک و قوم کی خدمت کا جو جذبہ اول دن اس میں پیدا ہوگیا تھا وہ بدستور قایم رہا اور آخر کار اس کو پورا کرکے دکھا دیا۔ چنانچہ آج کی صحبت میں ہم اس کی زندگی کا ایک ایسا ورق پیش کرتے ہیں جو غالباً اُردو داں پبلک کے سامنے کبھی نہ آیا ہوگا اور اگر اس کو دلچسپی کے ساتھ پڑھا گیا تو ہم اس بطل اعظم کی پوری زندگی اسی طرح نگار کے ذریعہ سے پیش کردیں گے — اس کے ابتدائی حالاتِ زندگی کو کسی دوسرے وقت پر ملتوی رکھتے ہوئے، فی الحال سلسلۂ سخن ہم اس زمانہ سے شروع کرتے ہیں جب جنگ عظیم کے بعد ترکی تقریباً فنا ہوچکی تھی اور تمام یوروپ اس کی موت کا فیصلہ سنا کر اپنی جگہ مطمئن ہوگیا تھا۔

---

(۱)

التوائے جنگ کو ایک ماہ کا زمانہ گزر چکا تھا کہ مصطفیٰ کمال قسطنطنیہ پہونچا۔ یہاں کا یہ عالم تھا کہ جہاز باسفورس میں

پڑے ہوئے تھے اور پایۂ تخت در دانیال کے علاوہ ہر قابل ذکر مقام پر برطانوی فوجوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ استنبول اور غلطہ پر فرانسیسی عساکر قابض تھے اور پیرا میں اطالیہ فوجیں خیمہ زن تھیں۔ پولیس، جندرمہ اور بندرگاہ کا نظم و نسق بالکل اتحادی افسران فوج کے ہاتھوں میں تھا اور قلعے مسمار کئے جا رہے تھے۔

مصر، شام، فلسطین اور عرب ہاتھ سے نکل چکے تھے اور ترکی عساکر اتحادی کی آہنی گرفت میں سکرات کے لمحے بسر کر رہی تھی۔ انجمن اتحاد و ترقی ختم ہو چکی تھی، انور، طلعت اور جمال بھاگ کر دوسرے ممالک میں پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ صرف ایک توفیق پاشا رہ گیا تھا، سو اس کا کام دشمنوں کے احکام کی تعمیل کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

ترک قوم اس وقت تھک کر بالکل چور چور ہو چکی تھی اور جسمانی و اخلاقی دونوں حیثیتوں سے اس کی حالت اس درجہ سقیم ہو گئی تھی کہ وہ فاتح دشمن سے اپنا ضایع شدہ ملک نہیں مانگتے تھے، بلکہ صرف یہ چاہتے تھے کہ اُس کو کسی نہ کسی طرح زندہ رہنے دیا جائے۔

بہ ظاہر یہ حالات ایسے نہ تھے کہ کسی قسم کی کوئی امید کسی شخص کو پیدا ہو سکتی، لیکن مصطفےٰ کمال جس کا نصب العین صرف کوشش کرنا تھا اب بھی مایوس نہ ہوا اور اس نے عزت پاشا سے ملکر کہا کہ "یقیناً اسوقت کھوئی ہوئی سلطنت کی واپسی کا سوال نہیں ہے شام و عرب پر دوبارہ قابض ہونے کا سوال نہیں ہے لیکن قومی عزت کا سوال تو آخر دم تک باقی رہتا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ توفیق پاشا کو جو اپنی غداری سے ترکوں کی رہی سہی عزت کو بھی تباہ کر رہا ہے برسر اقتدار رکھا جائے" اور کیوں نہ تم اس کی جگہ کام کرو"۔

عزت پاشا یہ سنکر دیر تک خاموش رہا اور پھر سوچکر بولا کہ "اگر تم کچھ کر سکتے ہو تو کرو، میں تمہاری مدد کیلئے طیار ہوں"۔

مصطفےٰ کمال، عزت پاشا کو ہموار کر کے دوسرے مقتدر لوگوں سے بھی ملا اور آخرکار انتہائی کوشش کے بعد وہ اس حد تک کامیاب ہو گیا کہ اس کی آواز سننا لوگوں کو گوارا ہونے لگا۔ چونکہ اس کی جرأت و بہادری کا سکہ پہلے ہی سے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا اور یہ سب کو یقین تھا کہ اسوقت یہی ایک شخص ایسا ہے جو فوجی قاید بننے کی صلاحیت رکھتا ہے، اس لئے وہ سمجھتے تھے کہ جو کچھ مصطفےٰ کمال کہتا ہے، اُسے کر دکھانے کی بھی اہلیت رکھتا ہے۔

وہ پارلیمنٹ ہاؤس میں بھی جاتا اور وہاں گھنٹوں گفتگو کرتا، الغرض رفتہ رفتہ وہ بعض سیاسی ہستیوں کو اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب ہو گیا اور یہ طے کر لیا کہ آیندہ اجلاس میں توفیق پاشا پر عدم اعتماد کا ووٹ پاس کر کے عزت پاشا کو اس کی جگہ متعین کر دیا جائے، لیکن جب اجلاس ہوا تو اس میں کامیابی نہ ہوئی اور وہی لوگ جنھوں نے مصطفےٰ کمال سے توفیق پاشا کے خلاف ووٹ دینے کا وعدہ کیا تھا، اس کے موافق ہو گئے۔ اس کا بڑا سبب

یہ تھا کہ لوگ مصطفےٰ کمال سے خایف بھی بہت تھے اور سمجھتے تھے کہ اگر یہ برسر اقتدار ہوگیا تو خدا جانے کیا انقلاب برپا کرے گا۔

مصطفےٰ کمال کو اپنی اس ناکامی پر غصہ تو بہت آیا، لیکن وہ مایوس نہیں ہوا۔ فوراً ٹیلی فون پر جاکر سلطان سے ملنے کی درخواست پیش کی۔

جب سلطان سے ملاقات ہوئی تو اس نے کہا کہ "اس وقت نہایت مضبوط حکومت قایم کرنے کی ضرورت ہے اور اگر آپ قوم کی ہمت بڑھانے کے لئے آمادہ ہوں تو اب بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ اور میں ترکی کی عزت قایم کردینے کا ذمہ دار ہوتا ہوں اگر محکمۂ فوج کی وزارت میرے سپرد کردی جائے۔ موجودہ پارلیمنٹ باغیوں اور غداروں سے بھری ہوئی ہے اور اس لئے اس کو معطل کردینا چاہئے"۔

سلطان — "میں جانتا ہوں کہ فوج پر تمھارا بڑا اثر ہے۔ لیکن کیا فوج میری وفادار رہیگی"۔

مصطفےٰ "میں ابھی آیا ہوں، اس لئے کوئی صحیح جواب نہیں دے سکتا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ فوج کی عدم وفاداری کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے"۔

اس گفتگو کے دوسرے دن سلطان وحید الدین نے پارلیمنٹ کو توڑ دیا اور داماد فرید کو وزیر اعظم بناکر عنان سلطنت اپنے ہاتھ میں لیلی۔ اس واقعہ سے لوگوں میں سخت ہیجان پیدا ہوا اور ہر چند اس کا ذمہ دار بالکل مصطفےٰ کمال کو قرار دیا گیا، لیکن سلطان نے اس کو کوئی خدمت سپرد نہ کی۔

مصطفےٰ نے ناکام ہوکر قسطنطنیہ چھوڑ دیا اور قریب کے ایک گاؤں (شِشلی) میں چھوٹا سا مکان کرایہ پر لیکر قیام کرلیا۔ یہاں صرف اس کا ایک دوست کرنل عارف ایسا تھا جس سے وہ راز کی باتیں کہہ سکتا تھا۔

اس واقعہ کو کئی ہفتے گزر گئے اور ۱۹۱۹ء کی ابتدا میں اتحادیئن کی گرفت کچھ ڈھیلی پڑنے لگی، کیونکہ اطالیہ فرانس اور انگلستان میں اندرونی اضطرابات کی وجہ سے فوجیں یہاں سے ہٹائی جارہی تھیں اور پھر یہ کہ اسوقت سب سے زیادہ اہم سوال جرمنی کے قلع قمع کا تھا، غریب ترکی کو کون پوچھتا جس کی موت کا یقین پہلے ہی سب کو ہوچکا تھا، چنانچہ لائڈ جارج کے مشیروں نے صاف صاف کہدیا تھا کہ "ترکی کو تو اسی حال پر چھوڑ دو کیونکہ اسکے اجزار تو خود منتشر ہوجائیں گے اور پھر ہم ٹکڑا ٹکڑا بانٹ لیں گے"۔

اس تغیر سے پھر بعض جماعتوں کو اُمید کی جھلک نظر آنے لگی لیکن قسطنطنیہ میں نہیں کیونکہ یہاں تو سلطان بالکل انگریزوں کے ہاتھ میں تھا اور ان کی گرفت بہت مضبوط تھی، البتہ اناطولیہ اور اندرون ملک کے دیگر حصوں

میں اس کے کچھ آثار پائے جاتے تھے، چنانچہ متعدد خفیہ انجمنیں قائم ہو گئیں اور دشمنوں کے ذخائرِ حرب کو چرا چرا کر اندرون ملک میں پہونچانے لگیں رفتہ رفتہ یہ تحریک قوی ہوتی گئی اور انگریزوں کو بھی معلوم ہو گیا کہ ترکوں میں پھر مقابلہ کا جذبہ پیدا ہو رہا ہے۔ مصطفےٰ کمال نہایت خاموشی سے اس انقلاب کو دیکھ رہا تھا، لیکن چونکہ وہ اس اسلوبِ کار کی کامیابی کی طرف سے مایوس تھا اس لئے اس نے کوئی عملی حصہ نہیں لیا۔

جب آہستہ آہستہ یہ انقلابی لہر زیادہ وسیع ہوئی اور انگریزوں نے محسوس کیا کہ اس فتنہ کا دبانا ضروری ہے تو انھوں نے سلطان سے کہا اور سلطان نے مصطفےٰ کمال کا نام اس خدمت کے لئے تجویز کیا۔ مصطفےٰ چونکہ انگریزوں کو گیلی پول میں سخت شکست دے چکا تھا اور وہ اس کے انقلابی ارادوں سے واقف تھے اس لئے انھوں نے مخالفت کی، مگر داماد فرید کی سفارش و ذمہ داری پر اس کو مشرقی صوبوں کا گورنر جنرل بنا دیا گیا۔

اس واقعہ سے مصطفےٰ کمال کی افسردہ تمناؤں میں پھر شگفتگی پیدا ہونے لگی، لیکن اسکی روانگی کے چند گھنٹے بعد ہی یہ حکم منسوخ کر کے مصطفےٰ کی گرفتاری کا حکم جاری کیا گیا کیونکہ مصطفےٰ پر انگریزوں کو اعتماد نہ تھا اور ان کو یقین ہو گیا تھا کہ اناطولیہ پہونچکر بجائے بغاوت فرد کرنے کے اور زیادہ قوت اس میں پیدا کر دے گا۔ مصطفےٰ کو جب اس کا علم ہوا تو وہ چھپ کر کسی نہ کسی طرح پہلے سمسون پہونچا اور پھر وہاں سے اماسیا پہونچکر جو بہت زیادہ اندرون ملک واقع تھا آزادی کی سانس لی، کیونکہ یہاں انگریزوں کا کوئی اثر نہ تھا۔

اس جگہ قیام کر کے اس نے تمام اطراف کے حالات تار اور ٹیلیفون کے ذریعہ سے معلوم کئے اور اس نتیجہ پر پہونچا کہ بحالت موجودہ ترکی کسی مقابلہ کے لئے طیار نہیں ہو سکتا۔ تمام فوج بیکار و منتشر ہو چکی تھی اور البتہ ایک سپاہ کاظم قرہ باقر کے پاس دیار بکر میں موجود تھی۔ اور سمرنا کے پہاڑوں میں کچھ جماعتیں یونانیوں کا حملہ روکنے کے لئے پائی جاتی تھیں، جن کی تنظیم رؤف کر رہے تھے۔

مصطفےٰ نے سیواس سے رفعت کو، انگورہ سے علی فواد کو اور سمرنا سے رؤف کو بلا کر مشورہ کیا کہ جس طرح ممکن ہو یونانیوں کا حملہ روکنا ضروری ہے اور اس کے لئے ایک قومی عسکری تنظیم لازم ہے، اسی کے ساتھ چونکہ سلطان انگریزوں کے ساتھ میں ہے اس لئے اناطولیہ میں ایک عارضی حکومت قایم کر لینا چاہئے۔ جب یہ سب طے ہو گیا تو مصطفےٰ کمال نے ملک کے تمام نمایندوں کو سیواس میں طلب کیا۔ دیار بکر سے کاظم قرہ باقر اور ورنہ سے جعفر طیار آ کر جلسہ میں شریک ہوئے اور قونیا کے کمانڈنگ افسر نے ذریعہ تار اپنی شرکت و ہمنوائی کی اطلاع

دی - جنگ کے بعد گویا یہ پہلا کامیاب قدم تھا جو مصطفیٰ کمال نے اُٹھایا - اس کے بعد مصطفیٰ نے ملک کا دورہ شروع کر کے ایک ایک گاؤں میں پہونچکر پروپاگنڈا شروع کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں پھر احساس پیدا ہونے لگا اور ایک عسکری روح از سر نو رونما ہونے لگی - اسی طرح ارض روم کا دورہ کر کے وہاں بھی اس تحریک کو زندہ کیا اس کے بعد گاؤں گاؤں فوجی بھرتی شروع ہونے لگی، اور جو ذخائر حرب فرانسیسی اور انگریزی فوجوں کی نگرانی میں دئے گئے انکو بھی کہیں کہیں چھین لیا -

ارض روم پہونچکر مصطفیٰ کمال نے سلطان کی طرف سے تمام کمانڈروں کو حکم بھیجا کہ ہتھیار انگریزوں کے حوالہ نہ کئے جائیں اور فوجوں کا اجتماع کیا جائے - اسی کے ساتھ اس نے سول حکام کے نام بھی احکام نافذ کئے اور ان کو ہدایت کی کہ کمیٹیاں بنا کر والنٹیر بھرتی کئے جائیں اور سمرنا کے قبضہ کے خلاف احتجاجی جلسے کر کے خوشحال لوگوں اور تاجروں سے ٹیکس وصول کیا جائے تاکہ فوجی مصارف اس سے پورے ہوں -

جسوقت یہ خبریں قسطنطنیہ پہونچیں تو انگریزوں کے غصہ کی انتہا نہ رہی اور سلطان بھی بہت برہم ہوا چنانچہ مصطفیٰ کمال کو ذریعہ تار اپنی فوجی خدمت سے معزول کر کے قسطنطنیہ طلب کیا گیا اس نے جواب دیا کہ "میں وہاں نہیں آسکتا اور جب تک ملک آزاد نہ ہو جائے گا میں اناطولیہ میں رہوں گا"

اس کے بعد اس نے اپنے ساتھیوں اور فوجی کمانڈروں کو بلا کر کہا کہ " مرکزی حکومت تو ہم سے علحدہ ہو گئی ہے، اس لئے اب آپ لوگ فیصلہ کیجئے کہ کیا کرنا ہے اگر آپ مرکزی حکومت کا ساتھ دیکر ملک کو غلام بنا دینے پر راضی ہیں تو آپ کی مرضی، لیکن اگر عزت کی زندگی چاہتے ہیں تو میرا ساتھ دیجئے اور عہد کیجئے کہ جو عزم ہملوگ کر چکے ہیں اس سے مُنھ نہ موڑیں گے"

لوگوں نے کہا کہ " ہم تمکو اپنا رہبر و سردار تسلیم کرتے ہیں، لیکن صرف اس شرط سے کہ سلطان کو کوئی نقصان نہ پہونچے"۔ مصطفیٰ کمال نے مصلحتاً اس کا وعدہ کر لیا اور اس طرح گویا پہلی بار اس کی عملی جنگ اتحادیین اور سلطان کے خلاف شروع ہو گئی -

اس کے بعد مصطفیٰ نے سیواس میں انعقاد کانگرس کی اطلاع تمام ملک کو دی اور کاظم قرہ باقر کے مشورہ سے قرب و جوار کے تمام فوجی لیڈروں اور نمایندوں کو ارض روم میں بلایا تاکہ کانفرنس میں شریک ہوں اسی وقت مرکزی حکومت کی طرف سے کاظم قرہ باقر کے پاس حکم پہونچا کہ مصطفیٰ کمال کو گرفتار کر کے کانفرنس روک دی جائے اور نمایندوں کو واپس کر دیا جائے - یہ وقت نہایت سخت تھا اور سلطان کے خلیفہ ہونے کی عظمت چونکہ بدستور لوگوں کے دلوں

میں قایم تھی، اس لئے کاظم باقر اپنی جگہ سے ڈگمگا گیا، مگر چونکہ قدرت کو کچھ اور منظور تھا اس لئے کئی دن کے غور و تامل کے بعد کاظم باقر نے اعلان کر دیا کہ "میں مرکزی حکومت کا ساتھ نہ دوں گا" اور اس طرح کشتی ڈوبتے ڈوبتے پھر بچ گئی۔

اُدھر سیواس کی کانگرس میں شرکت کے لئے تمام ملک سے نمایندے آرہے تھے اور پورے جوش کے ساتھ کام ہو رہا تھا۔ ادھر مرکزی حکومت نے کوشش کی کہ مصطفےٰ کمال کو سیواس پہونچنے سے پہلے پولیس کے ذریعہ سے گرفتار کر لیا جائے لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی اس کے بعد علی غالب گورنر ملیشیا کے نام سلطان کا حکم آیا کہ کُرد اقوام کو اُبھار کر کانگرس کے نمایندوں کو گرفتار کر لیا جائے۔ یہ سُنکر تمام نمایندے سخت برہم ہوگئے اور مصطفےٰ کمال نے کُردوں کو شکست دیکر راہ اور زیادہ صاف کر لی۔

اس کے بعد ایک مجلس عاملہ بنا کر مصطفےٰ کمال کو اس کا صدر کر دیا گیا اور چونکہ کُردی حملہ داماد فرید (وزیر اعظم) کے اشارہ سے کیا گیا تھا اس لئے قوم نے مرکزی حکومت سے مطالبہ کیا کہ داماد فرید کو معزول کر کے جدید پارلیمنٹ قایم کی جائے۔ جب اس کا کوئی جواب نہ آیا تو مصطفےٰ کمال نے محکمہ تار پر قبضہ کر کے قسطنطنیہ کا تعلق خبر رسانی تمام ملک سے قطع کر دیا اور مالی انتظام بھی اپنے ہاتھ میں لیکر موزوں عمال مقرر کرنا شروع کر دئے۔

آخر کار سلطان نے مجبور ہو کر داماد فرید کو معزول کر کے علی رضا کو مقرر کیا اور جدید پارلیمنٹ کے انتخاب کا فرمان نافذ کیا۔ اس سے لوگوں کا رُخ پھر مرکزی حکومت کی طرف پھر گیا اور مصطفےٰ کمال کی یہ تجویز کہ کانگرس کو ابھی قایم رکھا جائے اور پارلیمنٹ یہیں انگورہ میں منعقد کی جائے، کسی نے نہ مانی اور نتیجہ یہ ہوا کہ اب مصطفےٰ کو چھوڑ کر لوگوں نے رؤف کو اپنا لیڈر مقرر کیا اور قسطنطنیہ چلے گئے۔ مصطفےٰ بدستور انگورہ میں رہا اور اس نے وہاں جانا بیکار سمجھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ انگریزوں کے اثر کی وجہ سے پھر پارلیمنٹ ناکام ہوگی اور لوگ پھر اسی کے پاس دوڑے ہوئے انگورہ آئیں گے۔ اس اثناء میں مصطفےٰ آہستہ آہستہ فوجیں جمع کرتا رہا اور انگورہ میں بیٹھ کر اپنی مدافعانہ قوت کو خاموشی سے مضبوط بناتا رہا۔

اس طرف قسطنطنیہ میں جو تجربات قوم کے نمایندوں کو حاصل ہوئے وہ حد درجہ تلخ تھے، کیونکہ سلطان بالکل بے اختیار تھا اور انگریز یہ کیونکر گوارا کر سکتے تھے کہ ملک میں قومی روح پیدا ہو، ان کا مطالبہ یہ تھا کہ جو اصول ارض روم میں انھوں نے طے کر لئے تھے انھیں اُصول پر پارلیمنٹ کام کرے، یعنی ترکی کی آزادی علی حالہا برقرار رہے۔ مگر انگریزوں نے اس کو تسلیم نہیں کیا اور نمایندوں کو اپنے حقوق منوانے کی ہمت اس سے اور زیادہ بڑھ گئی کہ ملک

میں ہر جگہ انھیں کے موافق واقعات ظہور میں آرہے تھے۔ شمالی شام میں ترکوں نے فرانسیسیوں کو مار کر باہر نکال دیا تھا اور قلعہ جات عرفہ و عین تاب کا جو فرانس کے قبضہ میں تھے محاصرہ کر لیا تھا، اسی طرح انگریز بھی، قاف، کریمیا، اور اناطولیہ سے ہٹ رہے تھے کیونکہ فوجیں منتشر کی جا چکی تھیں، اور گیلی پول میں ایک فرانسیسی دستہ کو بھگا کر ان سے ہتھیار چھین لئے گئے۔ تھے۔

یہ حالات دیکھ کر انگریزوں نے سخت قدم اُٹھانے کا فیصلہ کیا لیکن چونکہ اندرون ملک سے ان کی فوجیں واپس جا چکی تھیں اور پایۂ تخت ہی میں ان کا زور چل سکتا تھا اس لئے ۱۶ مارچ ۱۹۲۰ء کو انھوں نے اپنے قبضۂ قسطنطنیہ کا اعلان کر کے رؤف اور فتحی وغیرہ چند قوم پرست افراد کو (حالانکہ وہ حقیقتاً ایسے نہ تھے) گرفتار کر کے مالٹا روانہ کر دیا اور پارلیمنٹ ہاؤس میں قفل ڈال دیا۔ عصمت، فوزی، عدنان اور خالدہ ادیب خانم بھاگ کر انگورہ چلے گئے اور بعض ترک سرداروں نے اناطولیہ کا رُخ کیا۔

اس واقعہ سے سلطان حد درجہ متاثر ہوا، کیونکہ وہ تو یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح وہ اور اس کی نام نہاد خلافت قائم رہے، لیکن اس کی یہ برہمی انگریزوں کا تو کچھ بگاڑ نہ سکتی تھی، اس لئے اس نے ترکی قوم پر اپنا غصہ اُتارنا چاہا اور سلیمان شوکت پاشا وزیر حربیہ کو حکم دیا کہ ایک بیقاعدہ فوج خلیفہ کے نام پر طیار کی جائے چنانچہ تمام ملک کے مولویوں کو جمع کر کے پروپاگنڈا شروع کیا اور سیکڑوں ہزاروں جتھے جاہل ترکوں کے جو خلیفہ و خلافت پر جان دیتے تھے۔ سلطان کی حمایت میں نکل کھڑے ہوئے — اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں سخت خانہ جنگی شروع ہوئی، بھائی بھائی کا دشمن ہو گیا اور باپ بیٹے کے خلاف تلوار کھینچکر میدان میں آ گیا۔ قونیہ میں تو سلطان کی فوج نے اتنی وحشت و بربریت ظاہر کی کہ مصطفےٰ کمال کی فوج کے افسروں کے ناخن نکلوا کر انھیں گھوڑے کی دُم سے باندھ کر گھسیٹتے گھسیٹتے مار ڈالا۔

سلطان نے اب داماد فرید کو پھر بلا لیا اور چن چن کر ان تمام آدمیوں کو اپنے پاس سے علیحدہ کر دیا جو قوم پرست جماعت سے ہمدردی رکھتے تھے، اسی کے ساتھ یہ فرمان نافذ کیا کہ مصطفےٰ کمال اور اس کی جماعت باغی جماعت ہے اور جو کوئی انھیں ہلاک کرے گا وہ دنیا و آخرت میں دونوں جگہ انعام و جزا کا مستحق ہو گا۔

شام کا وقت ہے، مصطفےٰ کمال، انگورہ کے مدرسۂ زراعت کی عمارت میں کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا ہے، فواد خالدہ خانم، اور اس کا شوہر عدنان بھی قریب ہی موجود ہیں، عصمت دوسری کھڑکی میں جھکا ہوا باہر دیکھ رہا ہے۔

آفتاب غروب ہوچکا تھا، تاریکی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی اور ان میں سے ہر شخص ترکی قوم کی بدبختی پر دل ہی دل میں رو رہا تھا۔ یونانی قتل و خونریزی کرتے ہوئے سمرنا سے آگے بڑھ رہے تھے، فرانسیسی جنوب کی طرف کامیاب اقدامات کر رہے تھے، سلطان کے ہواخواہوں نے مشرق میں کُردوں کو بھڑ اُبھار کر بدامنی پیدا کر رکھی تھی، اور یہ خانہ جنگی انگورہ کے قریب تک پہونچ چکی تھی،

سلطان کی فوجیں برابر کامیاب ہوتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں، اور اسمد و بغار پر قابض ہو کر بروصہ تک پہونچ گئی تھیں، قونیہ، اور بازار اور دوسرے جنوبی شہر سلطان کے طرفدار ہو گئے تھے، خود قومی افواج میں باہم پھوٹ پڑ چکی تھی اور بظاہر کوئی امید باقی نہ تھی کہ یہ فتنہ فرو ہو سکے گا۔

مصطفےٰ کمال ایک کرسی میں خاموش بیٹھا ہوا فکر میں مستغرق تھا، اس کا خاکی لبادہ چاروں طرف لپٹا ہوا تھا سیاہ استراخانی ٹوپی پیشانی پر ابرو تک کھنچ آئی تھی، ٹھوڑی سینے سے مل گئی تھی، اس کے چہرہ پر جھریاں ہی جھریاں نظر آ رہی تھیں اور اس کو ساری دنیا تاریک نظر آ رہی تھی ـــ وہ اسوقت ایک جنرل تھا بغیر فوج کے، صوبہ کا حاکم تھا بغیر رعایہ کے، اس کی تمام تدبیریں خاک میں مل رہی تھیں، اس کی جملہ امیدیں مٹی میں ملائی جا رہی تھیں اور کچھ نہ کر سکتا تھا ـــ وہ دفعتہً اُٹھ کھڑا ہوا، اس کی آنکھیں سرخ تھیں، اس کے بال کھڑے ہوئے تھے، اس کے اعصاب تن کر فولادی تار بن گئے تھے اور وہ ایک زخمی شیر کی طرح بپھر کر فیصلہ کر چکا تھا کہ اگر آزادی ترکی کی قسمت میں نہیں ہے تو اس کے لئے جان دیدینے کا موقعہ اس سے بہتر کبھی نہیں آسکتا۔

مصطفےٰ کمال ہمیشہ کا بیمار تھا، درد گردہ کے دوروں اور بخار کے پے در پے حملوں نے اسے بہت ضعیف کر دیا تھا، اسی کے ساتھ ذہنی و روحانی خستگی نے اسے کسی قابل نہ رکھا تھا، لیکن قومی محبت کی وہ آگ، ملی غیرت کا وہ شعلہ جو ایک بار بھڑک کر پھر کبھی افسردہ نہیں ہوتا، برابر بھڑک رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مصطفےٰ کمال کے اندر کوئی اور غیر معمولی قوت کام کر رہی ہے ـــ وہ تمام رات لیمپ جلا کر میز پر کام کرتا رہا اور لمحہ لمحہ کی خبروں پر غور کر کے اپنے آئندہ اقدامات کے نقوش قایم کرتا رہا۔ وہ پیالی پر پیالی قہوہ کی خالی کرتا جاتا تھا، سگرٹ پر سگرٹ پیتا جاتا تھا۔ کبھی وہ سوجاتا تو عارف اس کی حفاظت کے لئے جاگتا رہتا، کبھی عارف سوجاتا تو وہ بیدار رہتا۔ اسکی پشت پر عصمت سیاہ لباس میں ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا، کبھی کھڑکی کے باہر جا کر جھانک لیتا، کبھی مصطفےٰ کمال کے پاس آکر کسی امر میں مشورہ کر لیتا، خالدہ ادیب ریوالور لئے ہوئے بیٹھی تھی اور عدنان زہر کی پڑیا لئے ہوئے کہ اگر خدانخواستہ سلطان کی فوج آجائے تو گرفتار ہونے سے قبل جان دیدیں۔ دوسرے کمرہ میں فوزی بھی کام میں مصروف تھا

اور نیچے مسلح گھوڑے طیار تھے۔

آخر کار صبح ہوئی اور مصطفٰے کمال جان دینے اور جان لینے کا آخری عزم کرکے اس طرح نکل کھڑا ہوا گویا اب اسے لوٹ کر واپس آنا ہی نہیں ہے۔ وہ اسوقت ایک بھرا ہوا شیر تھا، خونخوار وظالم شیر۔ نہ کسی سے رحم کا طالب تھا نہ کسی پر رحم کرتا تھا، وہ دیوانہ وار بڑھتا تھا اور شہاب ثاقب کی طرح سروں پر ٹوٹ کر گرتا تھا، آگ، تلوار، خون اس کے رفیق تھے اور اس کے منھ سے سوائے اس کے کوئی لفظ نہ نکلتا تھا کہ "آزادی یا موت"۔۔۔ پھر اسکا نتیجہ کیا ہوا۔۔۔ اس کو سیاسیئین یوروپ سے پوچھو، مستعمرین مغرب سے دریافت کرو۔۔۔ ان پر ایک سکتہ سا طاری تھا کہ دفعتہً یہ بساط کیونکر الٹ گئی، نقشۂ جنگ کس طرح بدل گیا۔۔۔ یونانیوں کا قدم جہاں تک بڑھا تھا اسی جگہ روک دیا گیا، سلطان کی فوجوں کو تہ تیغ کرکے انگورہ کو خطرہ سے آزاد کر دیا گیا، مراش پر حملہ کرکے فرانسیسی و آرمنی فوجوں کو پسپا کر دیا گیا، کرد پامال ہوگئے، اطالیہ کے فوجی دستوں کو قونیہ سے ہٹا دیا گیا، اینتی شہر میں انگریزی فوج کو نکال کر ساحل تک پہونچا دیا اور تمام اتحادی افسروں کو گرفتار کرکے قید کر لیا گیا۔

رفتہ رفتہ جب یہ خبر تمام ملک میں پھیل گئی کہ قسطنطنیہ پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا ہے اور سلطان ملک وقوم کا دشمن ہے تو قومی خودداری کے جذبات پھر ابھرنے لگے، مرکزی حکومت اور سلطان کی طرف سے لوگ متنفر ہوگئے اور مرد وعورت جوق درجوق، مصطفٰے کمال کے جھنڈے کے نیچے آکر جمع ہونے لگے۔

مصطفٰے کمال نے اعلان کیا کہ انگورہ میں نئی پارلیمنٹ کا افتتاح ہوگا اور ملک کے تمام وہ نمائندے، جو جوش و خروش کے ساتھ قسطنطنیہ گئے تھے انگورہ پہونچ گئے اور جمعیتہ قومی کے قیام کا اعلان کرکے مصطفٰے کمال کو اسکا صدر منتخب کیا۔

کل مصطفٰے تنہا، بے یار و مددگار تھا لیکن آج وہ پوری قوم کا سردار بنا بیٹھا تھا۔ اور جمہوریت فرانس کے پریسیڈنٹ کے پیام کا جواب ان الفاظ میں دے رہا تھا:۔

"جب تک پایۂ تخت غیروں کے ہاتھ میں ہے، ترکی کی قسمت کا فیصلہ انگورہ کی گرینڈ نیشنل اسمبلی کے ہاتھ میں ہوگا۔۔۔ اسمبلی نے ایک مجلس انتظامیہ مقرر کر دی ہے اور عنان سلطنت اسی کے ہاتھوں میں ہے۔۔۔ چونکہ قسطنطنیہ، سلطان اور وہاں کی حکومت، دشمن کے قبضہ میں ہے اس لئے وہاں کے احکام کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ ترکی قوم آزاد حکومت کے تمام حقوق حاصل کرکے رہیگی اور اگر وہ کسی صلح کو قبول کر سکتی ہے تو وہ صرف عزت کی صلح ہے۔"

یہ تھے وہ الفاظ جو ترکی کے جدید حکمراں کے مُنھ سے نکلے تھے اور یقیناً دنیا کا یہ حیرتناک واقعہ ہے کہ وہ پورے ہو کر رہے۔ مصطفےٰ کمال ترک ہے اور اپنے ترک ہونے پر وہ ہمیشہ فخر کرتا ہے، وہ غیرت و خودداری کا مجسمہ ہے اور ترک قوم کی ذلت کو کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔ جسوقت اس نے لارڈ کرزن کی وہ تقریر سُنی جس میں اس نے ترکوں سے اس طرح خطاب کیا تھا گویا کہ وہ ترک قوم کا بڑا مربی ہے تو وہ غصہ سے کانپ اُٹھا اور بولا کہ:۔

"یہ، یہ انگریز کسی دن سمجھیں گے کہ ہم بھی وہی ہیں جو وہ ہیں۔ وہ مجبور ہوں گے کہ ہم سے برابر کا سلوک کریں۔ ہم اپنا سر کبھی ان کے سامنے نہ جھکائیں گے اور جب تک ہماری قوم کا ایک فرد بھی زندہ ہے ہم انکا مقابلہ کریں گے یہاں تک کہ ہم ان کی تہذیب کو انھیں کے سروں پر مار کر چور چور کر دیں۔"

پیرس میں صلح کانفرنس کی کارروائیاں جاری ہیں، اور ۵۰۰ نمایندگان اخبار کے ہجوم میں، پریسیڈنٹ ولسن، لائڈ جارج اور کلیمنشو دنیا کا نقشہ بنانے میں اس طرح مصروف ہیں گویا کہ اسوقت خدا کی خدائی ان کے ہاتھ میں ہے دفعتہً ترکی انقلاب کی خبریں ان کو پہونچتی ہیں اور وہ حیران رہجاتے ہیں کہ یہ کیا ہوا، ترکی جس کا سر کچل دیا گیا پھر کیونکر اُبھرا، اور مصطفےٰ کمال جو فوج کا ایک معمولی افسر تھا اس نے ملک پر کیا سحر کر دیا ـــــ آخر کار انھوں نے عہد نامۂ سیورے کے شرایط کا اعلان کر دیا اور اس طرح گویا ترکی کی موت کا حکم سنا دیا۔

(۱) ترکی حکومت صرف اناطولیہ میں محدود رہیگی، لیکن سمرنا اس سے چھین لیا جائے گا۔

(۲) ترکی کے مالی انتظام کی سخت نگرانی کی جائے گی۔

(۳) کمیشن مقرر کر کے ترکوں کی فوجوں کی جمعیت کو درہم برہم کیا جائے گا۔

(۴) پولیس و جنڈرمہ پر نگرانی قایم کی جائے گی

(۵) ٹیکس اور کسٹمس بھی اُن کے ہاتھ میں نہ رہیگا۔

عہد نامۂ سیورے کا یہ اعلان ہونا تھا کہ تمام ترکی میں آگ لگ گئی۔ وہ قوم جو ۵۰۰ سال سے حکمراں رہی تھی کیونکر اس ذلت کو گوارا کر سکتی تھی، انھوں نے اپنے ذاتی مناقشات ترک کر دئے، اور کمالی جماعت کے نام سے سب کے سب مصطفےٰ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے۔

مصطفےٰ نے فوراً ایک فوجی کیبنٹ قایم کر کے بکر سمیع، عدنان، فوزی، اور عصمت کو مختلف خدمتیں سپرد کیں اور مقابلہ کی طیاریاں ہونے لگیں ـــ اسوقت حالت یہ تھی کہ کاظم قرہ باقر نے شرقی سرحد کو آرمینی فوجوں سے صاف

کر دیا تھا، جنوب میں مقامی ترکوں نے بوزانتی سے فرانسیسیوں کو نکال کر التوائے جنگ کا معاہدہ حاصل کر لیا تھا۔ اور سوائے قسطنطنیہ کے جہاں اتحادی فوجیں پائی جاتی تھیں اور سمرنا کے جہاں یونانی دستے پڑے ہوئے تھے، اب ترکی میں کوئی فوج دشمنوں کی نہ تھی ــــ یوروپ کی طرف سے جعفر طیار بڑھا اور ایشیائی سمت سے علی فواد اور اسمد پر سلطان کی حامی فوجوں کو شکست دیکر انگریزی فوج سے تصادم ہوگیا۔

علی فواد نے یہ دیکھ کر کہ انگریز صرف جنوبی ساحل پر قابض ہیں ایک دستہ سواروں کا باسفورس کی طرف روانہ کیا اور انگریزی فوج متعینہ قسطنطنیہ میں اضطراب پیدا کر دیا ــــ اس وقت یوروپ کی سیاسی حالت عجیب تھی اور ہر ملک جنگ عظیم کے ردّ عمل کا شکار بنا ہوا تھا، اطالیہ بالشویکی انقلاب کے خوف سے سراسیمہ تھا، فرانس بالکل شام کی طرف متوجہ تھا اور جرمنی کا خوف اب بھی اس سے دور نہ ہوا تھا، برطانیہ کی جڑیں بھی ہل چکی تھیں۔ آئرلینڈ کی سول وار، عراق و ہندوستان کی بے چینی اور سرحدی خلفشار نے اس کو پریشان کر رکھا تھا، امریکہ اپنا دامن آلودہ کرنا ہی نہ چاہتا تھا ــــ الغرض ان حالات کے ماتحت اس وقت یوروپ کا کوئی ملک ایک سپاہی بھی ترکی کے مقابلہ میں بھیجنے کے لئے طیار نہ تھا ــــ قسطنطنیہ میں اتحادیئن کی فوجیں صرف چند ہزار تھیں اور ان کے لئے کوئی چارہ سوائے اس کے نہ تھا کہ تخلیہ کر دیں چنانچہ اتحادیئن کے کمانڈر نے کاغذات جلا دئے، ذخائر کو تباہ کر دیا اور شاخ زریں میں جہاز طیار ہو گئے۔

پریسیڈنٹ ولسن، لائڈ جارج، اور کلیمنشو نے جس وقت پیرس میں اتحادیئن کے اس ذلت کا حال سنا تو وہ غصہ سے بیتاب ہو گئے اور ان کی غیرت کسی طرح گوارہ نہ کر سکی کہ ترکی، ذلیل ترکی جو پشہ کی طرح ہر وقت مسل دیا جا سکتا ہے، ایک معمولی سپاہی مصطفٰی کمال کی سیادت میں اتنی سرکشی اختیار کرے ـ لیکن وہ کرتے کیا، حالات اتنے بدل گئے تھے کہ کسی فوج کا وہاں بھیجنا ممکن نہ تھا ــ وہ اسی فکر میں تھے کہ یونان کا وزیر اعظم وِنزلو نے جو وہیں موجود تھا، اپنی خدمات پیش کیں ــــ وِنزلو عرصہ سے یہ تمنا رکھتا تھا کہ یونان کسی طرح اناطولیہ کے بندرگاہ پر قابض ہو کر اپنی سلطنت وسیع کر سکے، چنانچہ موقعہ دیکھ کر اس نے کہا کہ "اسوقت سمرنا میں بہترین یونانی فوج موجود ہے اور اگر اس بات کا وعدہ کیا جائے کہ ترکی کا ایک معقول حصہ یونان کو دیدیا جائے گا تو ترکوں کو پامال کر دینے کا میں ذمہ دار ہوں"۔

خدایان صلح کانفرنس اس سے زیادہ اور کیا چاہ سکتے تھے، انھوں نے فوراً اس پر اظہار رضامندی کر دیا

اور دنیا کی اس مشہور جنگ کا آغاز ہوگیا جو ترکی کو تباہ کرنے کے بجائے اسکی حیات ابدی کا ضامن ثابت ہوئی۔

جسوقت مصطفےٰ کمال نے اپنی سپاہ کو جمع کر کے قسطنطنیہ پر حملہ کرنا چاہا، اسی وقت یونانیوں نے آگے بڑھنا شروع کیا۔ یہ جون ۱۹۲۰ء کی ۲۳ تاریخ تھی۔

چونکہ ترکی فوج اسوقت نہایت سقیم حالت میں تھی، نہ اُن کے پاس وردی تھی نہ کھانے پینے کا سہارا، نہ کوئی ترتیب تھی نہ کوئی تنظیم، اس لئے ظاہر ہے کہ یونانیوں کے اس اقدام کو کیونکر روکا جاسکتا تھا۔ انھوں نے جعفر طیار کو تھریس میں شکست دیکر اس کو گرفتار کرلیا، اور ادرنہ پر قابض ہوکر یورپین ترکی کے حصہ کو ترکی فوجوں سے بالکل صاف کردیا۔ یونانیوں کی دوسری فوج سمرنا سے شمال کی طرف بڑھی اور اسمد سے ترکوں کو ہٹاکر قسطنطنیہ کی طرف ایشیائی حصہ کو بھی اپنے قبضہ میں کرلیا۔ اس کے بعد ان کی قلبی فوج کا حصہ اندرون ملک کی طرف بڑھا تاکہ اناطولیہ کی ریلوے لائن پر قبضہ کرلیا جائے۔ لیکن نصف راستہ طے کیا ہوگا کہ اتحادیئن نے انھیں وہیں ٹھہر جانے کا حکم دیا اور چھ مہینے تک اسی محاذ پر قایم رہے۔

اُدھر مسلسل شکستوں کی وجہ سے ترکی میں پھر بددلی پیدا ہوئی اور اسمبلی مصطفےٰ کمال کی جان کی دشمن ہوگئی۔ چنانچہ جب اس کا اجلاس ہوا تو مصطفےٰ کمال اس میں اس طرح شریک ہوا گویا کہ اس نے کوئی قتل کیا ہے اور موت کا حکم اس کے خلاف سنایا جانے والا ہے، لیکن جب اس نے اپنی تقریر شروع کی اور شکست کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے بتایا کہ ساری ذمہ داریاں اسکی سلطان پر عاید ہوتی ہیں جس نے باقاعدہ فوجوں کو توڑ دیا ہے، ہتھیار دشمنوں کے حوالے کردئے ہیں اور خانہ جنگی سے ملک کو تباہ کررکھا ہے، تو لوگوں کا غصہ کچھ کم ہوا اور پھر اسکے بعد جب مصطفےٰ کمال نے ترکی قوم کی غیرت و خودداری سے اپیل کرتے ہوئے کہا کہ "کیا یہ ممکن ہے کہ وہی یونانی جو کل تک ہمارے غلام تھے آج ہم پر حکومت کریں" تو پھر ایک لہر جوش و خروش کی لوگوں میں پیدا ہوگئی اور سب کے سب مصطفےٰ کمال کا ساتھ دینے کے لئے آمادہ ہوگئے۔

مصطفےٰ کمال نے بتایا کہ اسوقت یونانیوں کی مدد کیلئے کوئی مغربی سلطنت طیار نہیں ہوسکتی اور اگر اب بھی ہم یونانیوں کو شکست نہ دے سکے تو پھر اس کے بعد کبھی ممکن نہ ہوگا۔ اسنے پھر تمام ملک میں امید افزا پیام کو پہونچایا اور پھر کوشش شروع کی کہ یونانیوں کے مقابلہ کیلئے تازہ فوج فراہم کرے۔ بعض لوگ اب بھی مُصر تھے کہ جن شرائط پر بھی صلح ہوسکے کرلینی چاہئیے، کیونکہ ممکن ہو آیندہ اسکا موقعہ بھی نہ رہے، لیکن وہ یہ سُنکر کہدیتا تھا کہ "تم بُزدل ہو، بے غیرت ہو، مجھ سے الگ رہو، کہیں مجھے بھی تمھاری ہوا نہ لگ جائے"۔ الغرض اسنے ترکوں کی ٹوٹی ہوئی ہمت کو پھر اُبھارا اور پھر قسمت آزمائی کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ (باقی)

بیراگ کا بروگ

(بہ سلسلۂ جولائی)

(۶)

گزشتہ واقعہ کو ایک ہفتہ گزر گیا ہے اور اسوقت تک راجہ رتن گڈھ کی طرف سے کوئی بات ایسی ظاہر نہیں ہوئی جو کملا کے روزانہ معمول یا اسکے خیالات کی موجودہ رفتار میں حارج ہوتی ۔ وہ ڈر رہی تھی کہ مبادا اس کا باپ سوامی جی کے خلاف کوئی نامناسب حکم صادر کرے یا اُن کو یہاں سے نکل جانے کی ہدایت کرے، لیکن چونکہ راجہ رتن گڈھ بہت سنجیدہ شخص تھا اس لئے جب بعد کو اس مسئلہ پر غور کیا تو کوئی ایسا طریق عمل اختیار کرنا اس کو مناسب نہ معلوم ہوا، جو سارے قصبہ کو چونکا دیتا اور لوگوں کو سرگوشیوں اور قیاس آرائیوں کا موقعہ دیتا ۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگر اس نے سوامی جی کو نکلوا دیا تو یقیناً لوگوں کو خیال پیدا ہوگا کہ اس میں کوئی معاملہ کملا رانی کا ضرور شامل ہے کیونکہ اب یہ تقریباً ہر شخص کو معلوم ہو گیا تھا کہ کملا، اُن کی چیلی ہو گئی ہے اور ممکن ہے اس سے کوئی بدنامی پیدا ہو جائے اور جگدیش پور والوں تک بھی اس کی خبر پہونچ جائے ۔ اس لئے وہ کملا کے سامنے یہ کہنے کو تو کہہ گیا کہ سوامی جی کو آج ہی نکلوائے دیتا ہوں، لیکن بعد کو جب تنہائی میں اس نے غور کیا تو فی الحال خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا، کیونکہ اگر ایک طرف اس کو بدنامی کا خیال تھا تو دوسری طرف اپنی بیٹی کی مشتعل طبیعت سے بھی واقف تھا اور وہ ڈرا کہ سختی کہیں اور زیادہ ضد نہ اس میں پیدا کر دے ۔

اس نے سب سے زیادہ کارآمد تدبیر یہ سوچی کہ جسقدر جلد ممکن ہو کملا کی شادی کر دی جائے، چنانچہ اس نے جگدیش پور اطلاع دی کہ چونکہ وہ ہندوستان کے تمام مقدس مقامات کی جاترا کے لئے جانا چاہتا ہے، اس لئے اگر شادی مہینہ کے اندر ہی اندر ہو جائے تو مناسب ہے، اس نے اپنے یہاں کے پنڈتوں کے ذریعہ سے جگدیش پور کے پنڈتوں کو بھی دے دلا کر ملا لیا اور آخر کار یہ بات طے پا گئی کہ اگلی پورنماشی کو بارات آئے گی، اور ریاست میں نہایت تیزی سے تمام اہتمامات ہونے لگے ۔

صبح کا وقت ہے بادل گھرے ہوئے ہیں، کبھی کبھی بجلی چمک اُٹھتی ہے اور کملا حسب معمول سوامی جی کے پاس بیٹھی ہوئی گفتگو میں مصروف ہے۔

سوامی جی —— "میں نے سُنا ہے کہ اگلی پورنماشی کو تمھاری شادی ہونے والی ہے"

کملا —— "ہاں، مہاراج، سُنا تو میں نے بھی ہے"

سوامی —— "یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ دس ہزار تولہ سونا اور ۹ من چاندی گلائے جانے کا حکم دیا گیا ہے"

کملا —— "ہاں یہ بھی میں نے سنا ہے"

سوامی —— "اتنی گراں قیمت کس چیز کی ادا کی جا رہی ہے۔ محبت کی ؟ نہیں۔ بلکہ تمھارے ہونے والے شوہر کی، اور صرف اس لئے کہ وہ تم کو تمھارے دیس اور تمھاری ماں باپ کی آغوش سے جدا کر دے، کملا، تمھیں معلوم ہے کہ اتنا سونا کتنی بیگناہ مخلوق کا خون بہا کر فراہم کیا گیا ہے، کیا تم جانتی ہو کہ اتنی چاندی کتنی عرق آلود پیشانیوں کی تمناؤں کو پامال کر کے حاصل کی گئی ہے۔۔ کاش زیور سے لدی ہوئی دُلھنیں سمجھ سکتیں کہ دنیا کی کتنی بد دعاؤں کا بار اُن کے جسم پر ہے اور اُن کے زرکار لباس کتنے مجروح جسموں کے ریشے سے طیار کئے گئے ہیں۔ اُف، دولت کے یہ خونچکاں کھیل قدرت دیکھ رہی ہے اور کچھ نہیں کہتی، دُنیا کی فضا میں ہر طرف فریاد و آہ کی صدا گونج رہی ہے اور کوئی اس کا سننے والا نہیں" —— ہاں، کملا، تمھارے لئے کیا کیا زیور طیار کئے جا رہے ہیں، کتنا قیمتی ٹیکا تمھاری پیشانی کے لئے تجویز ہوا ہے۔ کتنی زرکار ساریاں تمھارے جسم کے لئے انتخاب کی گئی ہیں"

کملا یہ سنکر خاموش سر جھکائے بیٹھی رہی اور کچھ جواب نہ دیا۔ تھوڑے انتظار کے بعد سوامی جی بولے "کیوں، کیا تم کو میرا کہنا ناگوار ہوا۔ آہ، کملا، معلوم نہیں، میں کیوں تم سے تمام وہ باتیں کہدیتا ہوں جو صرف پرمیشور کے سامنے کہنے کی ہیں"

کملا نے اپنی گردن، لانبی صندلی رنگ کی سڈول گردن اُٹھائی اور حزیں و ملول نگاہوں سے سوامی جی کی طرف دیکھ کر بولی —— "مہاراج، کیا اس وقت آپ کا یہ کہنا پرمیشور کے سامنے نہیں ہے، کیا اس نے یہ سب کچھ نہیں سُنا"

سوامی —— نہیں کملا وہ ایسی باتیں اسی وقت سنتا ہے جب سولی پر چڑھ کر کہی جائیں ہتیلی پر سر رکھ کر

سُنائی جائیں — میں بزدل ہوں، کم ہمت ہوں — اُس سے تو کہہ سکتا نہیں، تم سے کہتا ہوں —
حالانکہ مجھے سمجھنا چاہیئے کہ تم راجہ کی بیٹی ہو اور راجہ کی بیٹی کا شوہر بھی راجہ ہی ہوا کرتا ہے"

ٹھیک اسی وقت نہایت تیز کوندا لپکا اور اتنی سخت گرج ہوئی کہ ساری پہاڑی گویا ہل کر رہ گئی — کملا جو باوجود مضبوط دل رکھنے کے بھی آخرکار ایک عورت ہی تھی اور عورت بھی کمسن، محلوں میں پلی ہوئی، ڈر گئی اور سہم کر اسقدر سمٹی کہ سوامی جی کے جسم سے، اس کا جسم مل گیا اس حال میں کہ دونوں جسموں کی عریانیوں کے درمیان صرف ہلکی ریشمی ساری کا پلو حایل تھا — سوامی جی نے بے اختیارانہ اس کے نرم و نازک اور لچیلے جسم کو اپنے ہاتھوں سے سنبھال کر اپنے سے اور زیادہ قریب کر لیا، لیکن فوراً ہی گویا کہ یہ اتصال خود بجلی کا احساس تھا، ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ ایک طرف وہ شرمائی ہوئی علحدہ بیٹھی کانپ رہی تھی اور دوسری طرف سوامی جی کا دل جلدی جلدی دھڑک کر فوارے سے پر فوارے خون کے تمام جسم میں دوڑا رہا تھا۔ //

(۷)

رتن گڈھ سے سوامی جی کو گئے ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا ہے اور کسی کو خبر نہیں کہ وہ کیوں دفعتہً اس طرح چلے گئے اور کہاں؟ کملا کا باپ بہت خوش ہے کہ وہ کملا کی بارات آنے سے پہلے ہی غائب ہو گئے ورنہ ممکن تھا کہ دولہا کے کانوں تک بھی کوئی بات پہونچتی اور کملا کی بدنامی کا باعث ہوتی۔ خود کملا کی کیا کیفیت ہے، اس کا جاننے والا سارے رتن گڈھ میں سوائے اس کے دل کے اور کوئی نہیں۔

آخری ملاقات کے بعد دو دن تک کملا خود شرم کی وجہ سے سوامی جی کے پاس نہیں گئی اور جب تیسرے دن وہاں پہونچی تو اُس جگہ کو خالی پایا جہاں زندگی میں سب سے پہلی مرتبہ دو بجلیوں کے تصادم نے اس کو لرزہ براندام کر دیا تھا۔ وہ حیران تھی کہ سوامی جی کہاں چلے گئے اور گئے تو اطلاع کیوں نہیں دی۔ وہ ایسا محسوس کرتی تھی کہ کوئی چیز سینہ کے اندر سے اُٹھ کر منہ کو آ رہی ہے، اس کا بدن کانپ رہا تھا، اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی زندگی میں کوئی نہایت وسیع خلا پیدا ہو گیا ہے اور وہ اس کے اندر گرتی جا رہی ہے — وہ تھرتھرا کر اسی جگہ بیٹھ گئی جہاں سوامی جی بیٹھا کرتے تھے، کبھی وہ فرش کی چٹانوں کو دیکھتی اور کبھی در و دیوار کے پتھروں کو گویا ہر ایک سے پوچھتی تھی کہ سوامی جی کہاں گئے — لیکن اس سوال کا جواب دینے والا وہاں کوئی نہ تھا۔

اس نے سوچا اور اپنے خیال میں بالکل صحیح سوچا کہ شاید اس دن کے واقعہ نے سوامی جی کو برہم کر دیا، لیکن اس نے جو کچھ کیا وہ بالکل غیر اختیاری بات تھی — اس خیال کے آتے ہی اُس وقت کا پورا منظر اسکی نگاہوں کے

سامنے آگیا- وہ بجلی کی کڑک، وہ اس کا سہمکر سوامی جی سے لپٹ جانا اور اپنے جسم میں غیر معمولی گرمی محسوس کرکے فوراً علٰحدہ ہوجانا- اس کے بعد اس کا شرماکر دیر تک خاموش بیٹھے رہنا —— اس کے بعد وہ جزئیات کی تنقید میں محو ہوگئی اور غور کرنے لگی کہ سوامی جی کے جسم سے اس کا جسم مس ہونے کے بعد جو کیفیت اس پر طاری ہوئی وہ کیا تھی- کیا اس نے کوئی خاص لذت محسوس کی، بیشک محسوس کی لیکن شاید اس کا تعلق دو جسموں کے ظاہری اتصال کے سوا قلب سے نہ تھا- اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز اس کو کھینچ رہی ہے اور اس کھنچ جانے میں اس کو لطف آرہا ہے —— اگر واقعی سنسنی کو لطف سے تعبیر کیا جاسکتا ہے —— سوامی جی کے جسم سے ملکر اس کا جی یہ کیوں چاہنے لگا کہ وہ فاختہ کی طرح پر سمیٹ لے اور وہیں سمٹ کر رہجائے، غالباً اس لئے کہ ہوا سرد تھی، بارش ہورہی تھی- تاہم اس میں برہمی کی کیا بات تھی کیا سوامی جی کو یہ ناگوار ہوا کہ اس کا گناہگار جسم اُن کے پاک جسم سے مس ہوگیا- لیکن خود انھوں نے کیوں اپنی آغوش میں اس کو کھینچ لیا تھا، اگر اس کا جسم اس قابل نہ تھا تو علٰحدہ کرنے کے بجائے اس کو اپنے سے اور زیادہ قریب کیوں کرلیا- خیال و تصور کی چھان بین اسی حد تک پہونچی تھی کہ وہ پھر دفعتہً رُک گئی — اس کے چہرہ کی سفیدی میں سُرخ سُرخ لکیریں دوڑنے لگیں، کنپٹی کی رگیں تڑپنے لگیں، کان کی لو گرم ہوگئی، گردن کی شریان خون کی روانی سے اُبھر آئی، پیشانی کے ینلگوں عرق زیادہ نمایاں ہوگئے آنکھوں میں دھواں سا بھر کر چند موٹے موٹے قطرے آنسوؤں کے پلکوں تک آکر رُک گئے اور ایک ایسی کیفیت کے ساتھ جو ذرا اور بڑھ جائے تو ربودگی اور جنون کا فرق مٹادے، ایک چٹان کا کنارہ پکڑ کر اُٹھ بیٹھی اور دیر تک کھڑی سوچتی رہی کہ اب کیا ہونا ہے-

وہ آہستہ آہستہ اس حقیقت کی تلخی کو نہایت شدت سے محسوس کرتی جاتی تھی کہ سوامی جی کے ساتھ اسکا تعلق بہ نسبت روح کے شاید جسم سے زیادہ تھا اور یہ اس کے نفس کا فریب تھا کہ اسوقت تک اس حقیقت سے اسے بیخبر رکھا- لیکن کیا محبت کوئی اختیار کی چیز ہے، اور کسی کو دیکھتے رہنے کی آرزو کوئی گناہ ہے وہ بے اختیار کہہ اُٹھی :- " آہ سوامی، آپ کیا کرگئے، جب تک پاس تھے، دوری کا خیال بھی چنداں تکلیف دہ نہ تھا اور اب کہ آپ دور —— خدا جانے کتنی دور —— ہیں، نزدیکی کا تصور بھی سکون پہونچاتا نظر نہیں آتا —— کیا اسی کا نام محبت ہے- اُف کتنی تکلیف دہ چیز ہے، کیسی دہکادینے والی آگ ہے — وہ اگر مجھ سے خفا ہیں تو میں اُن سے پوچھوں گی کہ کیوں —— اور اگر انھوں نے کہا کہ " تم مجھے محبت میں مبتلا کرنا چاہتی تھیں "، تو میں سوال کروں گی کہ کیا محبت بُری چیز ہے اور اگر انھوں نے کہا کہ ہاں، تو پھر —— مگر نہیں وہ ایسا نہیں کہہ سکتے

اُف، اس وسیع دُنیا میں انھیں کہاں ڈھونڈھوں، وہ اب کیوں ملنے لگے، ہاں، وہ تو مجھے تباہ کرنے آئے تھے سو تباہ کر چلے ۔ بہتر ہے ۔۔۔۔۔" اس کی آواز بھرانے لگی، وہ خاموش ہوگئی، اس کی آنکھوں میں آنسو آئے لیکن پلک تک آکر رُک جانے کے لئے نہیں بلکہ ڈھلکنے کے لئے، اُس کی ساری کے آنچل میں جذب ہوکر اتنے حصہ کو اور زیادہ رنگین بنا دینے کے لئے ۔۔۔

(۸)

رتن گڈھ کا قلعہ، نہایت قدیم راجپوت وضع کا قلعہ ہے، وہی چاروں طرف خندق، اور پُل وہی دروازے کے پھاٹک، وہی فصیلیں اور اسی طرح کے بیسیوں پیچ در پیچ راستے جو محل کے مختلف حصوں تک پہونچکر ساری عمارت کو بھول بھلیاں بنا دیتے ہیں۔

ریاست کے اکثر ذاتی کارخانے محل کے اندر ہی واقع تھے اور وہ سونار خانہ بھی جہاں آج کل رانی کملا کے جہیز کے لئے زیور طیار ہو رہا تھا، اسی عمارت کے ایک گوشہ میں واقع تھا۔ باہر دروازہ پر مسلح سپاہی پہرہ دے رہے ہیں اور ایک فوجی افسر آنے جانے والوں کی نقل و حرکت کو نہایت غور سے دیکھتا جاتا ہے۔

اندر داخل ہوتے ہی ایک بڑا ہال نظر آتا ہے جس کے اندر چار بڑی بڑی بھٹیاں دہک رہی ہیں اور چاندی سونا پگھلا پگھلا کر ان سوناروں کو تول تول کر تقسیم کر دیا جاتا ہے جو درجنوں کی تعداد میں ہال کے کنارے کنارے چاروں طرف، اپنے تمام آلات و اوزار لئے ہوئے مصروف کار ہیں ۔ کوئی سونا کوٹ کوٹ کر اس کے بڑے بڑے پتّر طیار کر رہا ہے، کوئی جنتر سے تار نکال رہا ہے، کہیں صیقل ہو رہی ہے، کہیں ٹانکے دئے جا رہے ہیں ۔ الغرض ہتوڑیوں، دھونکنیوں، خرادوں اور نہائیوں کی مختلف قسموں کی آوازوں سے ملکر ایک عجیب قسم کی دماغ خراش صدا گونج رہی ہے ۔ ہال کے ایک گوشہ میں دروازہ ہے جو ایک مختصر سے کمرہ میں کھلتا ہے، جہاں ایک سردار کی نگرانی میں تمام زیور تُلنے کے بعد ذخیرہ کے کوٹھری میں رکھدیا جاتا ہے۔

سردار خوشحال سنگھ جو راجہ کے رشتہ میں ماموں ہوتے ہیں اس خدمت پر مامور ہیں اور دوسرے لوگوں سے جو وہاں بیٹھے ہوئے ہیں باتیں بھی کرتے جاتے ہیں ۔ اسی وقت گول پگڑی باندھے ہوئے ایک چوبدار ہاتھ میں چاندی کا عصا، سُرخ بانات کی وردی پہنے آتا ہے اور ایک چھٹی دیکر چلا جاتا ہے۔

سردار خوشحال سنگھ اس کو پڑھکر کچھ گھبرا سے جاتے ہیں اور فوراً کھڑے ہوکر سپاہی کو حکم دیتے ہیں کہ آج سے رات میں بھی کام ہوگا اور ذخیرہ کی کوٹھری میں جاکر ایک دوسرے سردار سے پوچھتے ہیں کہ ۔۔۔

اس وقت تک طیار شدہ اشیاء کی فہرست کیا ہے"

—— "چاندی کے اسباب میں دس ہاتھیوں کی آرائش معہ زنجیر، عماری، ٹیکہ اور کرن پھول کے طیار ہو چکی ہے اور دس کے لئے اور طیار ہونا باقی ہے۔ اسوقت تک ڈھائی سو من چاندی صرف ہو چکی ہے اور باقی ڈھائی سو من خزانہ سے آچکی ہے"

خوشحال سنگھ — "اچھا ڈھائی سو من چاندی اور آئے گی کیونکہ دس ہاتھیوں کی آرائش اور طیار کرنا ہے سونے کی چیزیں کیا کیا طیار ہو چکی ہیں؟

—— "اسوقت تک دس ہزار تولہ گلایا جا چکا ہے اور ۳۰۰ سٹ گھانے کے بن چکے ہیں، البتہ صیقل ہونا باقی ہیں"

خوشحال سنگھ — "بہتر ہے، پانچ ہزار تولہ سونا کل تک اور آئے گا، مہاراجہ کا حکم ابھی ابھی مجھے ملا ہے کہ پندرہ دن میں سب کام مکمل ہو جانا چاہئے"

یہ کہکر خوشحال سنگھ باہر نکلا ہی تھا کہ پنڈت ہیش دت وید آگئے اور دونوں ایک گوشہ میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

وید —— "کہئے سردار جی، آج کل تو آپ بہت مصروف ہوں گے"

"ہاں آج سے تو راتوں میں بھی کام ہوگا، دن بہت کم رہ گئے ہیں اور ابھی آدھا کام بھی نہیں بن سکا"

وید —— "مگر مجھے تو امید نہیں کہ ابھی یہ بیاہ ہو سکے"

سردار —— (چونک کر) کیوں، کیا بات ہے وید جی"

وید —— "رانی کملا کی بیماری بڑھتی جاتی ہے اور مجھے امید نہیں کہ وہ اتنی جلد اچھی ہو جائے گی"

سردار —— "سچ بتائیے، کوئی خطرہ تو نہیں ہے"

وید —— "سردار جی، خطرہ کی نہ کہو، انسان ہر وقت خطرہ میں ہے، معمولی زکام بھی ہلاک کرنے کے لئے کافی ہے اگر بڑھ جائے اور قسمت میں بچنا ہو تو کنوئیں میں گر کر بھی زندہ نکل آتا ہے، مگر ہاں اس میں شک نہیں کہ اسوقت تک کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوئی اور راجکماری کو اختلاج بڑھتا ہی جا رہا ہے"

سردار —— (نہایت آہستہ سے) کرن سنگھ جی تو بہت خوش ہوں گے۔ اور سچ پوچھو تو اُن کے کنور سے زیادہ موزوں کوئی ہو بھی نہ سکتا تھا۔ ریاست کے سب سے بڑے جاگیردار کا بیٹا، خوبصورت جوان پڑھا لکھا

قابل - ویدجی جسوقت سوچتا ہوں کہ نہ جانے کتنی پیڑھیوں کی جمع کی ہوئی دولت آج رتن گڈھ سے باہر چلی جارہی ہے تو میری حالت عجیب ہو جاتی ہے"

وید —— "سردار جی، آپ کو معلوم نہیں کہ یہ شادی تو صرف دولت ہی کے لئے کی جارہی ہے، آپ کو معلوم نہیں کہ جگدیش پور والوں نے اس معاملہ میں کتنی کوشش کی ہے، اور بیچ میں سرکار انگریزی کو ڈال کر ہمارے مہاراج کو راضی کیا ہے، ورنہ وہ خود نہ مانتے تھے۔ پر اب کیا ہو سکتا ہے، وہ تو جو کچھ ہونا ہے ہو کر رہیگا"

سردار —"کرن سنگھ کے کنور بھی تو سنا ہے باہر چلے گئے ہیں اور وہ شادی میں شریک نہ ہوں گے"

وید —— "ہاں، وہ آج کل نہیں ہیں، میں نے یہ بھی سُنا ہے کہ وہ اسی کوشش میں گئے ہیں کہ یہ شادی کسی طرح نہ ہونے پائے (نہایت آہستہ سے کان کے پاس منھ لیجاکر) بلکہ مجھے تو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ راجہ کرن سنگھ نے ایک گمنام خط جگدیش پور اس مضمون کا بھجوایا ہے کہ راجکماری کا چال چلن اچھا نہیں اور سوامی جی سے انکا تعلق رہچکا ہے"

سردار —— (چونک کر) - ہاں، یہ آپ کو کیونکر معلوم ہوا، کیا مہاراج کو بھی اس کا علم ہو چکا ہے"

وید —— مہاراج کو تو اس کا علم نہیں ہوا - اور نہ ہونا ہی اچھا ہے، ورنہ معلوم نہیں کیا نتیجہ ہو، سردار جی سچ کہوں مجھے تو اس شادی کا نتیجہ بہت بُرا نظر آتا ہے اور میرا ماتھا ٹھنکتا ہے کہ کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔ پرمیشر اچھا ہی اچھا کرے"

(باقی) نیاز فتحپوری

(نوٹ) یہ فسانہ ماہ آیندہ میں ختم ہوجائے گا۔

جمالستان

نیاز فتحپوری کے ۳۲ ادبی شاہکار اور افسانے جو اسی سال شائع ہوئے ہیں، اور ۵۷۵ صفحات پر محیط ہیں، پہلے اڈیشن کی جلدیں بہت کم رہگئی ہیں - اگر آپ نے اس وقت تک اپنی لائبریری کے لئے طلب نہیں فرمایا تو اب بھی قیمت مجلد للعہ غیر مجلد للعہ ر علاوہ محصول - منیجر نگار لکھنؤ

سلاطینِ سلف سب ہو گئے نذرِ اجل عثماں

مسلمانوں کا تیری سلطنت سے ہے نشاں باقی

اعلیحضرت خسرو دکن مدظلہ العالی کا مندرجۂ عنوان پیام جب میں نے پہلے پہل سُنا تو مجھ پر تھوڑی دیر تک ایک عجیب کیفیت طاری رہی میری نگاہوں کے سامنے عہد ماضی کی تاریخ اپنے اوراق اُلٹنے کے لئے بے چین ہو گئی وہ تاریخ جس میں "سلاطین سلف" کی شاہانہ سطوت و جبروت کے نقوش ابتک اُبھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ تاریخ جس کے اوراق پر عظمت و اقتدار کے ایسے ایسے مناظر ثبت ہیں جنھیں زمانہ کبھی فراموش نہ کر سکے گا۔ غزنویوں کا دبدبۂ فتحمندی، غوریوں کا آئینِ ہوشمندی غلاموں کے ستاروں کی بلندی، خلجیوں کی فراست و دانشمندی۔ تغلقوں کی خسرو پرستی، اور تیموریوں کا تدبر و اسلامی رواداری تاریخ کے حافظہ میں ابھی اُسی طرح باقی ہے اور فضائے بسیط میں خاندان تیموری کے آخری تاجدار کا یہ اخلاقی درس بھی اب تک محفوظ ہے کہ:-

ظفر آدمی اُس کو نہ جانئے گا گو ہو کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

غرض "بھارت ورش" کی اسلامی حکومتیں ان تاریخی اوراق میں میری ڈبڈبائی آنکھوں کے سامنے اس طرح آئیں کہ دلی کا چراغ ٹمٹما رہا ہے اور محمد شاہ رنگیلے کی عیش پرستی کا آفتاب لب بام آچکا ہے "اختر پیا" کی لکھنوی رنگ رلیاں سازشوں کا شکار ہونے لگی ہیں۔ بنگالے کے سورما شجاعت کے وہ جوہر کھو چکے ہیں، جن سے محرومی انسان کو صرف پہاڑوں میں روپوش ہونے کی تعلیم دے سکتی ہے، "تانا شاہ" کی مرہٹہ نوازی، حضرت راجو کا نام لیتے لیتے قلعہ سے باہر ہو گئی ہے، نظام شاہیوں کی حکومت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ عادل شاہیوں کا

عدل صرف زبانوں پر رہ گیا ہے، بہمنیوں کی عقیدت حضرت گیسو دراز کے قدموں پر نثار ہو چکی ہے، یہ تمام مناظر یکے بعد دیگرے میرے سامنے آئے اور میں " آہ یاد ایام "، کہتے خاموش ہو گیا۔

یہ تو خیر قصۂ ماضی تھا مگر جب عہد حاضر کی اسلامی حکومتوں پر نظر پڑی تو دیکھتا ہوں کہ ترکی خلافت کی ذمہ داریوں کا بار اپنے دوش سے اُتار چکا ہے اور اس کو اب عالمگیر اخوت اسلامی سے کوئی سروکار نہیں رہا۔ ایرانی رضاشاہ کے فہم و تدبر کا امتحان لے رہے ہیں اور عالم اسلامی سے بے خبر ہو کر اپنی خیر منا رہے ہیں، حجاز کی مرکزیت کعبہ کے احترام اور پیغمبر اسلام کی خوابگاہ ہونے کی وجہ سے گو ہمیشہ قایم رہے گی۔ لیکن یہاں کے تپتے ہوئے ریگستان میں اب کاروانِ رفتہ کے نقش قدم مسکراتے نظر نہیں آتے۔ خاک عراق کے منافق ذرّے آج بھی اس تاریکی سے آزاد نہیں ہوئے جو حسین کی مظلومی نے ان پر ثبت کی تھیں، دریائے نیل کی موجیں مدت ہوئی اپنی " آزاد روانی " سے محروم ہو چکی ہیں، افغانستان کی طوائف الملوکی سے کس کو اُمید ہو سکتی ہے کہ وہاں آرام سے پاؤں پھیلانے کی کبھی اجازت مل سکے گی۔

ان مایوس کن حالات نے ماضی کی طرف پھر لوٹایا تو پایۂ تخت ہند کے وزیر اعظم حضرت آصفجاہ اول کی مآل اندیشی تاریخی اوراق میں سامنے آگئی، یہ وہ زمانہ ہے جب تیموری سلطنت کے سنبھلنے کی کوئی اُمید باقی نہیں رہی تھی " رنگیلے عہد " میں ہر کس و ناکس کے دل پر مایوسی کے بادل چھا چکے تھے، ہر دماغ معطل ہو چکا تھا " رنگیلی قوتیں " جواب دے چکیں تھیں اور رہبری کی توقعات اُٹھ چکے تھے مگر ایک صرف حضرت آصف جاہ اول کا تنہا دماغ تھا جن کو دکن میں اپنا اور مسلمانوں کے بھٹکے ہوئے گلہ کا مستقبل مطمئن اور شاندار نظر آرہا تھا، انھوں نے خاندان تیموری کی عظمت و عزت کو سنبھالنے کا ارادہ کر لیا۔ مالوہ سے بزرگان دین کی دعائیں لیتے " سیدوں " کی سرکشیوں کو دباتے " نادری غصہ " کی شعلہ افگن آگ کو بجھاتے اور دہلی کے تخت کو " خدا حافظ " کہتے ہوئے اپنے مفوضہ صوبہ (دکن) میں داخل ہو گئے اور ہر مذہب و ملت کو اپنی پناہ میں لیکر عبادت الٰہی میں سربسجود ہو گئے۔ یہی تھے جنھوں نے ایسے وقت میں " دین حنیف " کو زندہ رکھا ورنہ کون تھا جو ہندی مسلمانوں کے زخموں کا اندمال کر سکتا۔ کیونکہ طوفان انقلاب نے جس قوم کی تباہی میں اندلسیوں کی طرح کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی اس کا آخری ٹھکانا سلطنت آصفیہ کے سایۂ عاطفت کے سوا اور کہاں ہو سکتا تھا خدا حضرت آصف جاہ اول کی روح کو آسودہ رکھے۔ جن کے شاہانہ عزائم کے صلہ میں مسلمانان ہند کو دکن میں امن و آسایش سے سانس لینے کا موقع مل گیا۔

حضرت اقدس و اعلیٰ اسی دودمان عالی کے ساتویں بادشاہ ہیں حضور نے بزرگان سلف کی سنت کو قائم رکھکر عالم اسلامی کو عموماً اور مسلمانان ہند کو خصوصاً یہ مژدہ جانفزا سنایا ہے کہ تمھاری ٹوٹی ہوئی امیدوں کا سہارا اور تمھارے بکھرے ہوئے اجزاء کا "نشان" سلطنت آصفیہ کے نام سے باقی ہے۔ (خدا ابدالآباد تک اس نشان کو باقی رکھے) اس سے وابستگی تمھارا اسلامی حق ہے اور اس کی وسیع آغوش تمھارے لئے ہر وقت کھلی ہوئی ہے، تمنے جس خواب ماضی کو تصور کی آنکھوں سے دیکھا ہے، اس کی تعبیر عہد حاضر میں اپنی مادی آنکھوں سے دیکھ لو!

حقیقت یہ ہے کہ اس شعر میں حضرت اقدس و اعلیٰ نے ایک ایسا جاں نواز پیام دیا ہے جو عالم اسلامی کیلئے یقیناً نوید حیات ہے، مصرعۂ اول میں "سلاطین سلف" ایک ایسا ٹکڑا ہے جس کا معنوی اثر فریاد کی صورت میں مسلمانوں کی مضمحل روحوں پر چھا جاتا ہے۔ اس غم کا مداوا جو کر سکتا ہے اس درد کو دلوں کے نہاں گوشوں سے جو نکال سکتا ہے اس اضطراب اور اس احساس بربادی کو مسلمانوں کی دم توڑتی ہوئی قوم کی روحوں سے جو مٹا سکتا ہے وہ عہد حاضر میں حضرت بندگان عالی ہی کی شاہانہ ذات ہے۔ جب ہی تو مصرعۂ ثانی میں ارشاد ہوتا ہے کہ

مسلمانوں کا تیری سلطنت سے ہے نشاں باقی

اس دلکش نغمہ کو سُن کر اطمینان و مسرت کو دعوت دیجئے، اس جمیل پیغام کو پڑھکر اپنی خوش نصیبی کو مبارکباد دیجئے، اور اس "روح پرور" "صلائے عام" پر لبیک کہکر زندہ ہو جائیے کیونکہ یہ پیام تمام ان برادران اسلام کے لئے ہے جن کی جبینوں سے اقصائے ہند کی بیشمار مسجدیں اب بھی آباد ہیں اور جن کی روحوں میں اب بھی حجازی نغمے پرورش پا رہے ہیں۔ یہ بشارت اس صبر آزما احساس شکستگی کے بعد ملی ہے، جب مسلمانان ہند کے سروں سے عظمت و اقبال کا سایۂ ہمایوں اُٹھ چکا تھا۔ اسی سے متاثر ہو کر مولانا حالیؔ نے اپنی شاعرانہ زبان میں اس طرح فریاد کی تھی کہ:۔

جاں دُش تھے للکارتے جن رہگزروں میں	دن رات بلند اُن میں فقیروں کی صدا ہے
جس دین کا تھا فقر بھی اکسیر غنا بھی	اس دین میں اب فقر بھی باقی نہ غنا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے	پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

مولانا حالیؔ زندہ ہوتے تو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور اپنے کانوں سے سُنتے کہ ان کی فریاد صدا بصحرا ثابت نہیں ہوئی بلکہ سلطنت آصفیہ کے "قصر معلیٰ" تک پہونچکر رہی اور "فریادرس" نے اس کا جواب شاعرانہ زبان میں دے کر تنہا حالیؔ کی بے چین روح کو نہیں بلکہ جملہ مسلمانوں کو سکون پہونچا دیا جسکے اظہار تشکر

میں مسلمانان ہند کی زبانوں سے ہمیشہ یہ دُعا نکلتی رہے گی۔

"خدا ہمارے بادشاہ دکن کو سلامت رکھے"

ہوشؔ بلگرامی

شہوانیات یا ترغیبات جنسی

حضرت نیاز کے قلم سے

جس میں فحاشی کی تمام فطری وغیر فطری قسموں کے حالات اور ان کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی اور آیندہ اخلاق انسانی کی بنیاد کن اصول پر قایم ہونا ہے۔ الغرض اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب بالکل نئی چیز ہے اور ایکبار شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے ہوئے آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ اس کتاب میں ایسے ایسے حیرت انگیز واقعات درج ہیں کہ آپ نے کبھی سُنے نہ ہوں گے اگر آپ نگار کے خریدار ہیں تو علاوہ محصول ۸ر کے مجلد کتاب صرف ۲؍ میں اور غیر مجلد عہ میں ملے گی اور اگر آپ نگار کے خریدار نہیں ہیں تو مجلد ۸؍۳ میں اور غیر مجلد ۳؍ میں علاوہ محصول ۸ر کے ملیگی۔

اگر

ارشاد ہو تو کتاب بذریعہ وی۔ پی روانہ کی جائے حجم ۲۷۵ صفحات آرڈر میں مجلد و غیر مجلد کی صراحت ضروری ہے۔

منیجر نگار لکھنؤ

فلسفۂ مذہب

مذہب اسلام اور اس کے مراسم شعائر پر تفصیلی بحث و تنقید، اگر آپ اسلام کی تقلید سمجھ کر کرنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کا مطالعہ کیجئے بہت کم جلدیں رہ گئی ہیں۔ قیمت علاوہ محصول عہ

منیجر نگار۔ لکھنؤ

فصاحت لکھنوی کی اصلاحیں

فصاحت لکھنوی، امانت لکھنوی کے بیٹے تھے، اور اُن کے انتقال کو زیادہ زمانہ نہیں گزرا۔ میں نے خود ۱۹۰۹ء میں سندیلہ کے مشاعرہ میں ان کو غزل پڑھتے سُنا اور اس کے بعد بھی وہ کئی سال تک زندہ رہے تغزل ان کا بالکل لکھنوی رنگ کا تھا اور سوائے رعایت لفظی یا محاورہ و زبان کے ان کی غزل میں اور کوئی چیز نہ ہوتی تھی۔ امانت کی واسوخت جن حضرات نے دیکھی ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اُن کے بیٹے کا رنگ شاعری کیا ہونا چاہئے تھا۔

بہرحال وہ لکھنؤ کے اساتذہ میں ضرور تھے اور جس حد تک زبان کی صفائی کا تعلق ہے اُن کے اُستاد تسلیم کرنے میں کسی کو تامل نہیں ہو سکتا۔ ان کے شاگردوں کی تعداد کا مجھے علم نہیں لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ نواب داراب علیخاں (تیموری شاہزادہ) کو بھی ان سے نسبت تلمذ حاصل تھی۔ نواب داراب علی خاں سطوت تخلص کرتے تھے اور فصاحت سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔

اتفاق سے حیدر آباد کی لائبریری میں سطوت کا قلمی دیوان نظر سے گزرا جو فصاحت کا درست کیا ہوا ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ سطوت کی شاعری نہایت ہی ادنیٰ قسم کی شاعری ہے لیکن فصاحت نے جو اصلاحیں دی ہیں وہ نہایت دلچسپ ہیں اور ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فن میں ان کو کس قدر ملکہ حاصل تھا۔ چند نمونے ذیل میں درج کرتا ہوں:۔

سطوت کا شعر ہے:۔

باہیں گردن میں مری ڈال کے کہتا ہے وہ شوخ
آج تو مجھ سے اے سطوت ترا دل شاد ہوا

شعر کی سخافت ظاہر ہے اور لفظ (اے) اتنی بُری طرح دبکر نکلتا ہے کہ پورا شعر نظری ہونے کے قابل تھا، مگر فصاحت نے اپنی اصلاح سے اس میں ایک رنگ پیدا کر دیا۔ ان کا اصلاح کیا ہوا شعر یہ ہے:۔

باہیں گردن میں مری ڈال کے سطوت وہ شوخ ہنس کے کہتا ہے کہ اب تو ترا دل شاد ہوا

سطوت :- بیکار غم فراق کا کھایا غضب کیا کیوں اس صنم سے دل کو لگایا غضب کیا

اس شعر میں ایک نہایت نازک غلطی یہ تھی کہ لفظ (کیوں) دوسرے مصرعہ میں بیکار ہے۔ فصاحت نے اس کو محسوس کرکے دوسرا مصرعہ یوں کر دیا :-

دل اپنا اس صنم سے لگایا غضب کیا

اب پورا شعر صاف ہو گیا اور زبان کی روانی پیدا ہو گئی۔

سطوت :- افسوس دشمنوں کی نگاہوں پہ چڑھ گیا مجھ کو صنم نے پاس بٹھایا غضب کیا

بظاہر اس شعر میں کوئی نقص نہیں معلوم ہوتا، لیکن ذوق محسوس کرتا ہے کہ دوسرے مصرعہ میں کسی بات کی کمی ضرور پائی جاتی ہے۔ فصاحت نے اُس کمی کو اس طرح دور کیا :-

محفل میں اس نے پاس بٹھایا غضب کیا

سطوت :- آئے وہ میری قبر پہ ہمراہ غیر کے دل خود دُکھا تھا اور دُکھایا غضب کیا

ایک نقص تو اس شعر میں یہ تھا کہ قبر کا ذکر کرکے شاعر نے مفہوم بالکل مہمل کر دیا تھا، کیونکہ مرنے کے بعد دل دُکھنے اور دُکھانے کا معاملہ کوئی معنی نہیں رکھتا، اس کے علاوہ دوسرے مصرعہ میں (دُکھا تھا) کے بجائے (دُکھا ہوا تھا) ہونا چاہئے تھا — اُستاد فصاحت نے اصلاح دیکر یہ دونوں نقص دفع کر دئے اور روانی پیدا کر دی:

آئے ہمارے گھر میں وہ ہمراہ غیر کے دُکھتا ہوا دل اور دُکھایا غضب کیا

بلایا غیر کو اس شمع رو نے اپنی محفل میں مرا دل مثل پروانہ جو جل جاتا تو کیا ہوتا

دوسرے مصرعہ میں لفظ (جو) بالکل زاید ہے۔ اصلاح نے اس نقص کو دور کر دیا :-

مرا دل صورتِ پروانہ جل جاتا تو کیا ہوتا

سطوت :۔ قتل کرنے جب بلایا اس بتِ سفاک نے ناتوانی سے قدم آگے بڑھا کر رہ گیا

خیر مفہوم و مضمون تو جیسا ہے ظاہر ہے، لیکن فنی نقطۂ نظر سے ایک نقص یہ ہے کہ ضمیر نہ ہونے کی وجہ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ کون قدم آگے بڑھا کر رہ گیا اور دوسرے یہ کہ قدم بڑھانا خود فرطِ ناتوانی کے منافی ہے۔

فصاحت نے اس شعر میں اصلاح دیکر اس کو بہت بلند کر دیا ملاحظہ ہو :۔

شرم آئی پیشِ منعم، جب گیا بہرِ سوال کچھ نہ بولا منھ سے ہاتھ اپنا بڑھا کر رہ گیا

سطوت :۔ خزاں کے ہاتھ سے کیا آج ہی پامال وہ گلشن ہزار افسوس کل جس باغ میں شورِ عنادل تھا

چونکہ دوسرے مصرعہ میں لفظ (باغ) موجود ہے، اس لئے پہلے مصرعہ میں لفظ (گلشن) بیکار ہے علاوہ اس کے سلاست و روانی بھی مفقود ہے۔ فصاحت نے اس میں بھی خوب اصلاح دی ہے :۔

گلستاں ہائے کیا آباد تھا فصلِ بہاری میں کہیں کوکو تھی قمری کی، کہیں شورِ عنادل تھا

سطوت :۔ عجب تقدیر ہی وہ نزع میں آئے تھے بالیں پر نہ کی کچھ بات اُن سے لب ہلانا ہمکو مشکل تھا

پہلے مصرعہ میں لکھنوی زبان کے لحاظ سے (نزع میں آنا) بالکل بے معنی سی بات تھی کیونکہ نزع اک کیفیت کا نام ہے اور جب تک اس کے ساتھ کوئی اور لفظ وقت کے معنے میں استعمال نہ کیا جائے مفہوم پیدا نہیں کرتا۔ دوسرے مصرع میں (نہ کی کچھ بات اُن سے) بھی بہت ڈھیلی بات تھی۔ اصلاح سے یہ دونوں نقص دور ہو گئے :۔

وہ بالیں پر ہمارے نزع کے ہنگام آئے تھے بھلا کیا بات کرتے لب ہلانا ہم کو مشکل تھا

سطوت :۔ نہایت آرزو ہی آکے پہلو میں وہ بُت بیٹھے خداوندا کسی دن تو بر آسے مدعا دل کا

پہلے مصرعہ میں (نہایت آرزو) بالکل غلط اور لفظ (بُت) بیکار تھا۔ اصلاح ملاحظہ ہو :۔

وہ دلبر آکے پہلو میں مرے بیٹھے یہ حسرت ہی

سطوت :۔ تڑپ کر تیری فرقت میں نکل جائیگا سینہ سے بہت مشکل ہی اب ایجان ہمکو تھامنا دل کا

اس شعر میں معشوق سے خطاب بہت غیر دلچسپ بات تھی اور (فرقت) کا اظہار بھی گراں گزرتا تھا۔

فصاحت نے اس شعر میں نہایت پاکیزہ اصلاح دی ہے:۔

تڑپ کر دیکھنا اک دن نکل جائیگا سینہ سے بہت مشکل ہی اُلفت میں عزیز و تھامنا دل کا

زبان و بیان دونوں حیثیت سے شعر پاکیزہ ہو گیا۔

سطوت:۔ تنگ ہوں زیست سے فرصت جو مجھے دیتا ضعف اپنے پاؤں سے میں ایدل سوے قاتل جاتا

پہلے مصرعہ میں لفظ (ضُعف) "ضوف" ہو کر ادا ہوتا ہے اور دوسرے مصرعہ میں (پاؤں) "پاؤون" ہو جاتا ہے۔ فصاحت کی بالغ نظری نے اپنی اصلاح سے یہ دونوں نقص دور کر دئے:۔

تنگ ہوں زیست سے مانع مجھے ہوتا جو ضعیف اپنے ہی پاؤں سے میں جانب قاتل جاتا

سطوت:۔ بدمزہ ہو کے مجھے قتل ہی کرتا شاید کان تک اس کے اگر شور سلاسل جاتا

معنی کے لحاظ سے شعر بہت رکیک ہے اس لئے فصاحت نے پہلا مصرعہ بدلدیا:۔

اپنے دیوانہ پر آتا اسے کچھ رحم ضرور

سطوت:۔ باغباں نالوں کی تاثیر نہیں کیوں ہوتی گوش گل تک نہیں کیا شور عنادل جاتا

پہلا مصرعہ بالکل مبتدیانہ ہے اور دوسرے مصرعہ میں جو دعوی کیا گیا ہے اس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا یعنی تاثیر نہ ہونے کی کوئی کیفیت ظاہر نہیں کی گئی۔ اصلاح بہت پاکیزہ ہے:۔

باغباں ہنسنے پہ اس کے ہی تعجب مجھ کو

لفظ (ہنسنے) سے دوسرے مصرعہ کا ثبوت پیش کر دیا گیا۔

سطوت:۔ افسوس وہ حسیں نہ رہی، وہ نہ ہم رہے وہ صحبتیں گئیں وہ زمانہ گزر گیا

دوسرا مصرعہ صاف تھا، لیکن پہلا بالکل لچر تھا۔ فصاحت نے اس کو بدل کر اک لطف پیدا کر دیا:۔

اب وہ حسیں رہے نہ وہ افسوس ہم رہے

سطوت:۔ حسینوں پہ کیوں ہائے عاشق ہوا مجھے بیٹھے بیٹھے یہ کیا ہو گیا،

دوسرے مصرعہ میں (بیٹھے بیٹھے) کا استعمال بے محل تھا، اس لئے فصاحت نے اسے یوں کر دیا:۔

مجھے بیٹھے بٹھلائے کیا ہو گیا

سطوت:۔ عجب حال ہے مجھ سیہ بخت کا بہار آئی سودا سوا ہو گیا،

پہلے مصرعہ میں صرف سودا کی رعایت سے (سیہ بخت) لایا گیا تھا، فصاحت نے پہلا مصرعہ بدلکر شعر میں جان ڈالدی:۔

ترے وحشیوں کا عجب حال ہے

(ترے وحشیوں) کے فقرہ نے عجب لطف پیدا کر دیا

سطوت:۔ زلفوں نے آکے ڈھانک لیا رُوئے پر ضیا ٹوٹا جو بند رات کو اس کے نقاب کا

فصاحت نے اس میں صرف ایک لفظ کا تغیر کیا ہے یعنی (آکے) کی جگہ (بڑھکے) بنا دیا ہے، لیکن اسی ادنیٰ تغیر نے اک کیفیت پیدا کر دی۔

سطوت:۔ بعد مُردن یہ محبت کا اثر باقی ہے کف افسوس ملے جب میں انھیں یاد آیا

پہلے مصرعہ میں لفظ (بھی) ہونا ضروری تھا اس لئے اُستاد نے یہ اصلاح دی:۔

بعد مُردن بھی یہ اُلفت کا اثر باقی ہے

سطوت:۔ جب سے کہ عاشقِ مژہ یار ہو گیا اک تیر تھا کہ دل سے مرے پار ہو گیا

پہلے مصرعہ میں (جب سے کہ) نہایت ہی ثقیل تھا اور دوسرے مصرعہ میں (اک تیر تھا) کہنا بالکل بے محل تھا کیونکہ (جب سے) کہنے کے بعد اس کا کوئی موقعہ ہی نہ تھا۔ اصلاح سے دونوں عیب مٹ گئے:۔

بے سمجھے عاشقِ مژہ یار ہو گیا یہ تیر ہائے دل سے مرے پار ہو گیا

سطوت:۔ مُنہ رکھ کے چشم یار پر آزار ہو گیا نرگس کا پھول سونگھ کے بیمار ہو گیا

مطلع بنانے کی کوشش میں شاعر نے اس شعر کو بالکل مہمل کر دیا تھا۔ اصلاح سے مطلع تو باقی رہا نہیں لیکن شعر خاصہ ہوگیا:۔

منھ رکھ کے چشم یار پہ غش آگیا مجھے ‏ ‏ ‏ ‏ نرگس کا پھول سونگھ کے بیمار ہو گیا

سطوت:۔ بہتر ہے ہجر یار سے سطوت جو آئے موت ‏ ‏ ‏ ‏ صدمے اُٹھائے زیست سے بیزار ہو گیا

انداز بیان کی ژولیدگی ظاہر ہے۔ دوسرے مصرعہ کا مفہوم یوں ادا ہونا چاہئے تھا کہ "اتنے صدمے اُٹھائے کہ زیست سے بیزار ہوگیا"۔ اصلاح کی پاکیزگی قابل داد ہے:۔

آخر کو زہر کھا لیا سطوت نے ہجر میں ‏ ‏ ‏ ‏ اس درجہ اپنی زیست سے بیزار ہوگیا

سطوت:۔ عجیب مجھ کو مزہ ملگیا فقیری میں ‏ ‏ ‏ ‏ خدا سے مانگ کے میں ملک و مال کیا کرتا

پہلے مصرعہ میں محض وزن پورا کرنے کے لئے بجائے (ملا) کے (ملگیا) استعمال کیا گیا تھا اس لئے فصاحت نے اس کو یوں بنا دیا:۔ ‏ ‏ عجیب مجھ کو ملا ہے مزہ فقیری میں

سطوت:۔ ہجر میں تیرے صنم جان لبوں پر آئی ‏ ‏ ‏ ‏ بخدا اسپہ تری یاد سے غافل نہ ہوا

پہلا مصرعہ بہت کمزور تھا اور دوسرے مصرعہ میں لفظ (بھی) ضروری تھا۔ اصلاح سے دونوں عیب مٹ گئے:۔

صدمۂ ہجر سہے، جان لبوں پر آئی ‏ ‏ ‏ ‏ لیکن اسپر بھی تری یاد سے غافل نہ ہوا

سطوت:۔ ہم کریں نالے اگر جا کر میانِ کوئے دوست ‏ ‏ ‏ ‏ ایک ہو دم میں زمین و آسمانِ کوئے دوست

دوسرے مصرعہ کی لغویت ظاہر ہے۔ اصلاح پاکیزہ دی گئی:۔

تنگ اپنی زیست سے ہوں ساکنانِ کوئے دوست

سطوت:۔ در و دیوار سے ٹکرا کے سر اپنا پھوڑا ‏ ‏ ‏ ‏ تو جو آیا نہ مجھے گھر میں نظر آج کی رات

اس میں اُستاد نے دوسرے مصرعہ کے (تو) کو (وہ) کر دیا اور اس میں کلام نہیں کہ اس ذرا سے تغیر سے شعر

بہت پرلطف ہوگیا۔

سطوت:- یا غیر کو یا مجھ کو صنم گھر میں بلاؤ — بس کہہ دو وہی تمکو جو ہے مدِنظر آج

پہلے مصرعہ کی بیہودگی اس قابل تھی کہ پورا شعر کاٹ دیا جاتا لیکن جناب فصاحت نے ایسا نہیں کیا اور اسی کو یوں بنا دیا:-

یا غیر کو یا مجھ کو صنم گھر سے نکالو

سطوت:- دم میں خود ہونگے فنا اے یار کیا انکو ثبات — کھیل سے آکر حبابوں کو لبِ ساحل نہ توڑ

پہلے مصرعہ میں (دم میں خود ہوں گے فنا اے یار) کا ٹکڑا بہت بُرا تھا۔ اُستاد نے مصرعہ بدلکر یوں کر دیا:-

خود فنا ہو جائیں گے اے شوخ انکو کیا ثبات

سطوت:- اے آسماں ملا مرے محبوب سے مجھے — دیکھوں گا اس کو میں تو مرا ہو گا غم غلط

اصلاح یہ دی گئی ہے:-

کہتے ہیں ہجر میں مجھے سب دیکھکر عزیز — ذکرِ وصال چھیڑئے، ہو جائے غم غلط

سطوت کا دیوان کافی ضخیم ہے اور ہر جگہ فصاحت کی اصلاحوں سے مزین نظر آتا ہے۔ مجھے حیرت اس پر نہیں کہ انھوں نے کیسی پاکیزہ اصلاحیں دی ہیں بلکہ تعجب اس پر ہے کہ انھوں نے ایسے لغو و مہمل کلام پر اتنا وقت کیوں ضایع کیا۔ لیکن اگر یہ صرف اُن کی وسعتِ اخلاق تھی، تو فصاحت کو شاعر سے بھی بڑھکر ولی کامل ماننا پڑے گا، کیونکہ اس سے نیچے درجہ کا انسان تو اتنا اور ایسا ایثار کبھی نہیں کر سکتا۔

جنوری ۳۵ء کا نگار

حسبِ معمول ضخیم شایع ہو رہا ہے۔ جو مکمل تبصرہ ہوگا لکھنؤ اور دہلی اسکول کی شاعری پر۔ نہ اس سے قبل کسی رسالہ میں اتنا مکمل تذکرہ آپ کو نظر آیا ہوگا، اور نہ کسی کتاب میں۔ ایک پرچے کی قیمت کا اندازہ عہ لگایا جاتا ہے۔ اگر آپ نگار کے خریدار ہیں تو خریداری جاری رکھئے اور اگر خریدار نہیں ہیں۔ تو جلد خریداروں میں اپنا نام درج کرائے اس کو مفت حاصل کیجئے۔ اس صورت میں آپ سے علٰحدہ کچھ قیمت نہیں لی جائے گی۔

مینجر نگار

سید محمد میر سوز

(دہلی کا ایک شاعر جس کو دنیا نے بہت کم یاد رکھا)

سوز کا ذکر تقریباً ہر تذکرہ میں نظر آتا ہے اور بجز آزاد کے کہ انھوں نے تو بیشک میر کے حوالہ سے انھیں پون شاعر مانا ہے، باقی تمام تذکرہ نویسوں نے ان کا ذکر اس احترام سے کیا ہے جو میر، سودا یا درد کے باب میں ظاہر کیا گیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ آزاد نے میر کا تذکرہ نکات الشعراء دیکھا ہی نہیں اور اگر یہ خود ان کی ذاتی اُپج نہیں تھی تو شاید صرف کسی زبانی روایت پر اعتماد کرکے، سوز کے متعلق میر کا یہ محاکمہ لکھ گئے، ورنہ ممکن نہ تھا کہ وہ ایسی خلافِ حقیقت بات لکھنے کی جسارت کرتے۔

آزاد نے، میر کے حالات میں اس واقعہ کو اس طرح ظاہر کیا ہے:۔

"لکھنؤ میں کسی نے پوچھا کہ کیوں حضرت آج کل شاعر کون کون ہے، کہا ایک تو سودا، دوسرا یہ خاکسار ہے، اور کچھ تامل کرکے کہا، آدھے خواجہ میر درد، کوئی شخص بولا کہ حضرت، اور میر سوز صاحب؟ چیں بہ جبیں ہوکر کہا کہ میر سوز صاحب بھی شاعر ہیں؟ انھوں نے کہا کہ آخر اُستاد نواب آصف الدولہ کے ہیں، کہا کہ خیر یہ ہے تو پونے تین سہی"

لیکن جس وقت ہم میر کا نکات الشعراء اُٹھا کر دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نہ وہ خواجہ میر درد کو آدھا شاعر سمجھتے تھے، نہ میر سوز کو پون بلکہ وہ ان دونوں کو پورا پورا شاعر جانتے تھے۔

درد کا ذکر تو انھوں نے اس احترام و ادب سے کیا ہے کہ شاید ہی کوئی خادم اس سے زیادہ ارادتمندی کا اظہار کرسکے اور جتنا اقتباس ان کے کلام کا بیش کیا ہے کسی اور شاعر کا لیا ہی نہیں۔

میر کے الفاظ عقیدت و ارادت ملاحظہ ہوں:۔

"جوشِ بہار گلستان سخن ــــ عندلیب خوشخوانِ چمن این فن ــــ در چمن شعرش لفظ رنگیں چمن چمن ــــ گلچین خیال او را گل معنی دامن دامن ــــ شاعرِ زور آور ریختہ ــــ در کمال علاقگی وارستہ ــــ فقیر را بخدمت او بندگی خاص است ــ"

یہ ہیں خیالات میر کے اس شاعر کے متعلق جو بقول آزاد اُن کے نزدیک نصف شاعر تھا ــ اب پون شاعر کے متعلق بھی اُن کی رائے سُن لیجئے کہ :-

"میر تخلص جوانے است بسیار اہل، خوش طبع"

معلوم ہوتا ہے کہ میر نے نکات الشعرا اس وقت مرتب کیا تھا جو سوز اپنا تخلص میر کرتے تھے - آزاد کے بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جب میر نے ان کا تخلص چھین لیا تو انھوں نے سوز تخلص اختیار کیا - درانحالیکہ نکات الشعرا کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تخلص خود سوز نے میر کے تتبع میں اختیار کیا تھا چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ :-

"از خوش کردن تخلص من نصف دلم از دو خوش است"

بہر حال سوائے اس ایک روایت کے جو آزاد نے بحوالہ میر درج کی ہے، کسی تذکرہ میں سوز کی اُستادی سے انکار نہیں کیا گیا بلکہ خود آزاد نے سوز کے ذکر میں ان کی بہت تعریف کی ہے - چنانچہ لکھتے ہیں کہ :-

"میر سوز مرحوم کی زبان عجیب میٹھی زبان ہے اور حقیقت میں غزل کی جان ہے، چنانچہ غزلیں خود ہی کہے دیتی ہیں، ان کی انشا پردازی کا حُسن، تکلف اور صنایع مصنوعی سے بالکل پاک ہے اس خوشنمائی کی ایسی مثال ہے جیسے ایک گلاب کا پھول ہری بھری ٹہنی پر کٹورا سا دہرا ہے اور سبز سبز پتیوں میں اپنا اصلی جوبن دکھا رہا ہے۔"

"مجالس رنگیں کی بعض مجلسوں سے اور ہمارے عہد سے پہلے کے تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کلام صفائی محاورہ اور لطفِ زبان کے باب میں ہمیشہ سے ضرب المثل ہے، ان کے شعر ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے کوئی چاہنے والا اپنے چاہیتے عزیز سے بیٹھا باتیں کر رہا ہے ــ میر تقی میر کہیں کہیں ان کے قریب آجاتے ہیں، پھر بھی بہت فرق ہے ــ"

میر حسن نے تذکرۂ شعرائے اُردو میں ان کی شاعری کے متعلق جو خیالات ظاہر کئے ہیں یہ ہیں :-

"شاعر شیریں بیان و سخن سنج زبانداں، گلدستۂ نثرش چوں گلشنِ حسنِ دلبراں تازہ، و گلہائے نظمش در کثرت چوں سیاہ غم بے اندازہ"

گلشن ہند میں مرزا علی لطف نے لکھا ہے کہ :-

"فن سخنوری میں اُستاد، طرزِ ادابندی کے بادشاہ - کلام ان کا سر سے پاؤں تک سوز و ساز ہے اور پاؤں سے سر تک ناز و نیاز"

بعد کے تذکرہ نویسوں نے بھی سوز کو اپنے عہد کا اُستاد کامل اور غزلگوئی میں ماہر بے بدل تسلیم کیا ہے، لیکن افسوس ہی کہ نہ آج ان کا دیوان ہمارے سامنے ہے اور نہ عہد حاضر کے نقادان سخن نے ان کے کمال پر کوئی روشنی ڈالی -

آپ کا نام سید محمد میر تھا اور میر ضیاء الدین کے بیٹے تھے - ان کا سلسلۂ نسب قطب عالم گجراتی سے ملتا ہی اور تصوف و درویشی ان کا آبائی ذوق تھا، چنانچہ اسی بنا پر میر حسن نے انھیں "فقیہہ بیمثال اور درویش باکمال" بھی ظاہر کیا ہے- تذکرۂ بزم سخن میں دہلوی مولد بخاری موطن مقیم لکھنؤ" لکھا ہے - ان کا خاندان بخارہ سے ہندوستان کس زمانہ میں آیا، اس کا پتہ چلانا دشوار ہے، اور نہ اس کی چنداں ضرورت کیونکہ بہر حال سوز دہلی ہی میں پیدا ہوئے، یہیں نشو و نما پائی اور اسی جگہ ایک اُستاد کامل کی حیثیت سے وہ مشاعروں میں شریک ہوتے رہے -

ان کا زمانہ متعین کرنے کے لئے ان کے سنہ ولادت کی جب جستجو کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی تذکرہ نویس نے اس تحقیق کی زحمت گوارا نہیں کی، لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ ان کا انتقال ۱۲۱۳ھ میں ہوا جبکہ ان کی عمر ۷۰ سال کی تھی[1] تو اس طرح ان کا سنہ ولادت ۱۱۴۳ھ ماننا پڑے گا اور اگر ۱۲۱۲ھ ان کا سنہ وفات تسلیم کیا جائے[2] (جو غالبًا درست نہیں ہے) تو سنہ ولادت ۱۱۴۲ھ متعین کیا جائے گا، بہر حال اس حساب سے میر سوز ۱۱۴۲ھ اور ۱۱۴۵ھ کے درمیان کسی سال میں پیدا ہوئے ہوں گے -

اب اسی کے ساتھ سوؔدا، دردؔ اور میرؔ کے سنین ولادت و وفات کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ سوؔدا ۱۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۹۵ھ میں انتقال کیا- درد ۱۱۳۸ھ کے قریب پیدا ہوئے[3] اور ۱۱۹۹ھ میں وفات ہوئی[4] — میر ۱۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے[5] اور ۱۲۲۵ھ میں انتقال کیا — اس طرح گویا ولادت کے حساب سے میرؔ و سوؔدا دونوں ایک ساتھ نظر آتے ہیں، اس کے بعد دردؔ اور پھر میر سوؔز لیکن وفات کے لحاظ سے یہ ترتیب یوں ہوتی ہے :-

سوؔدا — دردؔ — سوؔز — میر — سب سے کم عمر دردؔ نے پائی یعنی صرف ۶۱ سال جیے، اس کے بعد سوؔدا و سوؔز کا

---

[1] تذکرۂ گل رعنا۔ [2] تذکرۂ گلشن ہند [3] ان کا سنہ ولادت کسی تذکرہ میں نظر نہیں آیا لیکن چونکہ ان کا سنہ وفات آبحیات و گل رعنا میں ۱۱۹۹ھ لکھا ہے اور وقت وفات ۶۱ سال کی عمر بتائی جاتی ہے اس لئے ولادت ۱۱۳۸ھ میں ہوئی ہوگی [4] گلشن ہند میں سنہ وفات ۱۲۰۲ھ لکھا ہے۔ [5] میر کا سنہ ولادت بھی اُن کے سنہ وفات سے متعین کیا گیا ہے کیونکہ ان کی عمر ۱۰۰ سال کی بتائی جاتی ہے اور وفات ۱۲۲۵ھ میں ہوئی ہے -

نمیر ہے جو ستر سال جئے اور پھر میرؔ کا جو باوجود "غمِ عشق و غمِ روزگار" دونوں طرح کے صدمات اٹھانے کے پوری ایک صدی تک زندہ رہے۔

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ۲۰ سال کی عمر میں سوزؔ کی مشق سخن کافی ہو گئی ہوگی تو اسوقت سوداؔ اور میرؔ کی عمر ۲۸، ۳۸ سال کی رہی ہوگی اور دردؔ کی ۲۴ سال کی، گویا دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان چاروں نے چند سال کے فرق سے ایک ہی ساتھ شاعری کا آغاز کیا اور اس کا شباب بھی ساتھ ہی ساتھ رہا، یہی سبب ہے کہ جس وقت اس دور کے اساتذہ کا ذکر ہوتا ہے تو میرؔ، سوداؔ، اور دردؔ کے ساتھ سوزؔ کا نام بھی لیا جاتا ہے اور جس طرح اول الذکر تین اُستادوں کے متبعین پیدا ہو گئے تھے اسی طرح سوزؔ کے رنگ کا تتبع کرنے والے بھی اسوقت پائے جاتے تھے، چنانچہ میر شمس الدین ہوشؔ، میرزا حسین رضا عیشؔ، میرزا رضا قلی خاں آشفتہؔ ان کے ممتاز شاگردوں میں تھے اور متبعین میں خلیل شاہ سائلؔ، حیات اللہ اور انشاؔ کا نام لیا جاتا ہے لیکن بقول صاحب شعر الہند یہ بالکل صحیح ہے کہ "زمانہ دوسرا میرؔ، دوسرا سوداؔ، دوسرا دردؔ اور دوسرا سوزؔ پیدا نہ کر سکا"

سوزؔ، علاوہ شاعر ہونے کے خطاطی کے بھی ماہر تھے اور فنون سپہگری میں بھی کمال رکھتے تھے، خصوصاً تیر اندازی اور شہسواری میں خاص ملکہ حاصل تھا اور جسمانی طاقت بھی غیر معمولی رکھتے تھے۔

آزادؔ نے لکھا ہے کہ "۱۱۹۱ھ میں لباس فقر اختیار کیا اور لکھنؤ چلے گئے"، لیکن دوسرے تذکروں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سوزؔ دہلی چھوڑ کر پہلے فرخ آباد آئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب محمد شاہ رنگیلے کے بعد شاہ عالم کے دور میں دہلی پر تباہی آچکی تھی اور ایک ایک کر کے تمام اکابر فن اودھ کی طرف منتقل ہو رہے تھے۔ شاہزادگان میں سے مرزا محمد سلیمان شکوہ اور مرزا جہاندار شاہ بھی اسی طرف چلے آئے تھے، اور ان کے دربار شعراء کے مرجع بنے ہوئے تھے، چنانچہ مصحفیؔ و انشاءؔ اول اول سلیمان شکوہ ہی کے دربار سے وابستہ ہوئے اور بعد کو جراتؔ بھی یہیں آگئے۔ اسی طرح مرزا جہاندار شاہ کے دربار سے خواجہ میر دردؔ کے شاگرد مرزا محمد اسماعیل تپشؔ اور مرزا جعفر علی حسرتؔ وابستہ تھے۔

فرخ آباد میں نواب احمد خاں بنگش کا دیوان، مہربان خاں رندؔ شعرا کا بڑا قدردان تھا اور نواب محمد یار خاں امیرؔ کا دربار تو اس قدر افزائی کے لئے بہت مشہور ہو چکا تھا، چنانچہ قائمؔ چاندپوری اسی دربار کے مشاہرہ یاب تھے اور مصحفیؔ، شاہ حاتمؔ، اور مولوی قدرت اللہ بھی اسی امیر کے خوانِ کرم کے زلہ ربا تھے۔

مرشد آباد میں، مہاراجہ شتاب رائے، نواب غلام حسنین خاں، نواب اعظم خاں، نواب سعید احمد خاں صولت جنگ، نواب شوکت جنگ، نواب علاء الدولہ سرفراز خاں کے درباروں نے اس ..... میں کافی شہرت پائی اور لکھنؤ میں خود آصف الدولہ، نواب سعادت علی خان اور نواب احمد خاں (نواب حافظ رحمت خاں روہیلہ کے چھوٹے بیٹے) شعر وسخن کے بڑے قدر شناس تھے۔

الغرض سوز بھی ترک وطن کے بعد سب سے پہلے فرخ آباد گئے اور مہربان خاں رند کے دربار میں پہونچے، ان سے چند سال قبل سودا خود یہیں پہونچے تھے اور اسی امیر کی شاعر نوازی سے مستفید ہوئے تھے۔

فرخ آباد میں کچھ زمانہ بسر کرنے کے بعد مرشد آباد پہونچے اور اس کے بعد لکھنؤ آئے۔ ان کے لکھنؤ آنے کا زمانہ ۱۲۱۲ھ بتایا جاتا ہے جب نواب آصف الدولہ حکمراں تھا یعنی ۲۳ سال فرخ آباد اور مرشد آباد میں بسر کرنے کے بعد لکھنؤ پہونچے اور آصف الدولہ نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا لیکن اس کے ایک ہی سال بعد ۱۲۱۳ھ میں انتقال ہوگیا اور لکھنؤ میں دفن کئے گئے۔ صاحب تذکرۂ گلزار ابراہیمی نے لکھا ہے کہ ۱۱۹۶ھ میں وہ لکھنؤ میں تھے، اس لئے غالباً یہ بیان صحیح نہیں کہ وہ ۱۲۱۲ھ میں لکھنؤ آئے، یقیناً وہ اس سے بہت پہلے آچکے ہوں گے اور نواب آصف الدولہ نے کافی مدت تک ان سے اصلاح لی ہوگی[1]۔

اول اول جب دہلی میں تھے تو میر تخلص کرتے تھے لیکن دہلی چھوڑتے ہی اس کو بھی چھوڑ دیا اور سوز تخلص اختیار کیا، چنانچہ ان کا مشہور شعر ہے:-

کہتے تھے پہلے میر میر تب نہ ہوئے ہزار حیف　　اب جو کہے ہیں سوز سوز یعنی سدا جلا کرو

ان کے شعر پڑھنے کا رنگ بالکل نرالا تھا، چنانچہ آزاد نے لکھا ہے کہ "آواز دردناک تھی، شعر نہایت نرمی اور سوز و گداز سے پڑھتے تھے، شعر کو اس طرح ادا کرتے تھے کہ خود مضمون کی صورت بن جاتے تھے"۔ چنانچہ ایکبار جب انھوں نے اپنا یہ قطعہ پڑھا:-

گئے گھر سے جو ہم اپنے سویرے　　سلام اللہ خاں صاحب کے ڈیرے
وہاں دیکھے کئی طفل پریرو　　ارے رے رے ارے رے رے رے، ارے رے

تو چوتھا مصرعہ پڑھتے پڑھتے وہیں زمین پر گر پڑے۔

---

[1] نواب آصف الدولہ کی شاعری پر میرا ایک بسیط مضمون جنوری کے نگار میں شایع ہوگا اور غالباً دنیا کو یہ معلوم کرکے حیرت ہوگی کہ لکھنؤ میں بھی ایک شاعر ایسا ہوا ہے جو بجا طور پر دہلی کے شعرائے باکمال کے پہلو بہ پہلو پیش کیا جاسکتا ہے۔ نیاز

آبِ حیات میں لکھا ہے کہ کسی غزل کا ایک قطعہ اس انداز سے سنایا کہ مشاعرہ کے سب لوگ گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے، وہ قطعہ یہ تھا:-

اور مار سیاہ زلف سچ کہہ　　بتلا دے دل جہاں چھپا ہو
کنڈلی تلے دیکھیو نہ ہو وے　　کاٹا نہ ہفی[1] ترا بُرا ہو

"پہلے مصرعہ پر ڈرتے ڈرتے بچکر جھکے، گویا کنڈلی تلے دیکھنے کو جھکے ہیں اور جسوقت کہا "کاٹا نہ ہفی" بس دفعتہً ہاتھ کو چھاتی تلے مسوس کر ایسے بے اختیار لوٹ گئے کہ لوگ گھبرا کر سنبھالنے کو کھڑے ہوگئے" (آبِ حیات)

جس زمانہ میں سوز کی شاعری کا آغاز ہوا، اسے عہدِ وسطیٰ کا دورِ اول کہنا چاہئے۔ جب زبان کی صحت وصفائی کی طرف شعراء کو خاص توجہ ہو چلی تھی اور ولی دکنی اور ان کے ہمعصر شعراء کے محاورات و طرزِ ادا میں نمایاں تبدیلیاں کی جا رہی تھیں۔ چنانچہ اسی دور کا مشہور شاعر قائم کہتا ہے کہ:-

قائم، میں غزل طور کیا ریختہ، ورنہ
ایک چیز لچر سی بزبان دکنی تھی

یوں تو، غزل میں جذباتِ محبت کو بغیر کسی استعارہ و تشبیہہ کے ظاہر کر دینا شعراء متقدمین کی بھی خصوصیت تھی، کہیں ہندی و فارسی الفاظ کی آمیزش، ترکیب کی تعقید اور غیر مانوس قدیم محاورات نے اس میں وہ سلامت و روانی پیدا نہ ہونے دی جو "محبت کی زبان" کے لئے ضروری ہے۔ جس دور میں سوز پیدا ہوئے اسکی خصوصیت یہی تھی کہ اس نے زبان کی صحت وصفائی کی طرف خاص توجہ کی اور خصوصیت کے ساتھ سودا کو چھوڑ کر میر، درد، سوز اور قائم نے تو تغزل کی ایسی داغ بیل ڈالی کہ آج تک اس سے ہٹ کر کوئی دوسرا صحیح معیار قائم نہ ہو سکا۔ جس حد تک صرف غزلگوئی کا تعلق ہے اس میں کلام نہیں کہ میر تقی میر کا مرتبہ بہت بلند نظر آتا ہے، جس کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ انھوں نے سب سے زیادہ طویل عمر پائی اور اپنے بعد کلام کا بڑا ذخیرہ چھوڑ گئے لیکن اگر اس سے قطع نظر کر کے درد اور سوز کا مطالعہ کیا جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ زبان کی روانی، بیان کی سلاست طرزِ ادا کے بیساختہ پن میں ان دونوں کا پہلو بھی کسی طرح میر سے دبتا ہوا نظر نہیں آتا۔ بلکہ ایہام و لفظی رعایت

---

[1] افعی کو محاورہ میں ہفی کہتے ہیں۔

کے ساتھ رکیک خیالات میر کے یہاں تو نظر بھی آجاتے ہیں، لیکن درد و سوز کا کلام اس عیب سے بالکل پاک ہے۔ البتہ ان تینوں شاعروں کے سوز و گداز میں ضرور فرق ہے۔ درد کی شاعری کا نصب العین یا سرچشمہ چونکہ صرف روحانی یا ذہنی محبت ہے اس لئے ان کے اشعار پڑھنے کے بعد ایک شخص اپنے اندر وہ عامیانہ جذبات پیدا ہوتے ہوئے محسوس نہیں کرتا جو گوشت و خون سے متعلق ہونے والی محبت سے وابستہ ہوتے ہیں، میر کے یہاں جذبات عشق کا منبع یقیناً درد کا سا عمیق و پاکیزہ نہیں ہے، لیکن چونکہ ان کی محبت ناکام تھی اس لئے اُن کے سوز و گداز میں وہ عامیانہ رنگ پیدا نہیں ہوا جو عشق کامیاب کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ سوز کے واردات محبت ان دونوں کے مقابلہ میں زیادہ سطحی ہیں اور اس لئے جو کچھ وہ کہتے ہیں بالکل اسی دُنیا کی باتیں ہیں اور روز کی عاشقانہ زندگی میں جو کیفیات ہجر و وصال پیدا ہوتی ہیں، وہ انھیں سے بحث کرتے ہیں۔

وہ جذبات کا اظہار ہمیشہ صاف صاف الفاظ میں کرتے ہیں اور ان میں کسی قسم کا کوئی اغلاق نہیں ہوتا معلوم ہوتا ہے کوئی شخص کھڑا باتیں کر رہا ہے، لیکن کبھی کبھی ایسی لطیف و نازک تعبیرات کر جاتے ہیں کہ میر و درد کی دنیا سامنے آجاتی ہے۔ ان کا ایک شعر ہے:-

ایکباری دھک سے ہو کر دل کی پھر نکلی نہ سانس
کس شکار انداز کا یہ تیر بے آواز ہے

تیر بے آواز کے اثرات کو اس طرح ظاہر کرنا "پھر نکلی نہ سانس" اتنی پاکیزہ تعبیر ہے جو لفظاً و معناً دونوں حیثیت سے بہت بلند مرتبہ رکھتی ہے۔ اس سے بہتر اور اتنا بہتر شعر کہ شاید ہی اسکی دوسری مثال کہیں اور ل سکے یہ ہے:-

مجھ کو دھوکا دیا کہہ کر شراب
اے ان آنکھوں کا ہوئے خانہ خراب

خالص میر کے رنگ کے اشعار ملاحظہ ہوں:-

دو دن کی یہ زیست سوز صاحب — جس طرح نبھے تم اب نبا ہو
رسوا ہوا خراب ہوا، مبتلا ہوا — وہ کونسی گھڑی تھی کہ تجھ سے جدا ہوا
میں کاش اسوقت آنکھیں موند لیتا — یہ میرا دیکھنا مجھ کو بلا تھا
ہے شوخ مزاج سوز واللہ — چھیڑے گا اسے بُرا کرے گا
جس کا تو آشنا ہوا ہوگا — اس نے کیا کیا ستم سہا ہوگا

لوگ کہتے ہیں مجھے یہ شخص عاشق ہی نہیں عاشقی معلوم لیکن دل تو بے آرام ہے

فارسی ترکیبیں وہ بالکل استعمال نہیں کرتے اور اُن کے سارے کلام میں صرف ایک غزل ایسی ہی جسمیں غالبًا قافیہ سے مجبور ہو کر انھوں نے فارسی الفاظ استعمال کئے ہیں، لیکن اصلی رنگ ہاتھ سے نہیں گیا، ملاحظہ ہو:

برق تپیدہ یا شرر بر جہیدہ ہوں جس رنگ میں ہوں میں غرض از خود رمیدہ ہوں

اے آہ و نالہ مجھ سے نہ آگے بڑھو کہیں بچھڑا ہوں کارواں سے مسافر جریدہ ہوں

اے اہل دہر میں بھی مرقع میں دہر کے تصویر ہوں ولے لب حسرت گزیدہ ہوں

منت کش خزاں ہوں نہ حسرت کش بہار جوں سرو باغ دہر میں دامن کشیدہ ہوں

سوز کا اصلی رنگ جس میں وہ میر و درد سے بالکل علیحدہ نظر آتے ہیں حسب ذیل مسلسل اشعار کی غزل سے واضح ہوگا:-

مرا جان جاتا ہے یارو بچالو کلیجہ میں کانٹا گڑا ہے نکالو

نہ بھائی مجھے زندگانی نہ بھائی مجھے مار ڈالو، مجھے مار ڈالو

خدا کے لئے اے مرے ہمنشینو وہ بانکا جو جاتا ہے اس کو بلالو

اگر وہ خفا ہو کے کچھ گالیاں دے تو دم کھا رہو، کچھ نہ بولو نہ چالو

نہ آوے اگر وہ تمھارے کہے سے تو منت کرو گھیر سے گھائے منالو

کہو ایک بندہ تمھارا مرے ہے اُسے جان کندن سے چل کر بچالو

جلوں کی بُری آہ ہوتی ہے پیارے
تم اس سوز کی اپنے حق میں دعا لو

الغرض سادگی اور انتہا سے زیادہ سادگی ان کی خصوصیت تھی اور اسی لئے ان کے بعض اشعار اب بھی عوام میں زبانزد ہیں مثلاً:-

کی فرشتوں کی راہ ابر نے بند جو گنہ کیجئے صواب ہے آج

ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی

آبحیات میں لکھا ہے کہ:- "۱۲ سطر کے صفحہ سے ۳۰۰ صفحہ کا کل دیوان ہے اس میں ۲۸۸ صفحہ غزلیات ۱۲ صفحہ میں مثنوی، رباعی، مخمس ہیں"، لیکن افسوس ہے کہ اس وقت ان کا مکمل دیوان کہیں نہیں ملتا،

تذکروں میں ان کلام جتنا نظر آتا ہے وہ بہت کم ہے۔

اتفاق سے کتب خانہ آصفیہ (حیدر آباد دکن) میں ان کا ایک قلمی دیوان نگاہ سے گزرا جو ہر چند بہت مختصر ہے لیکن نہ اتنا کہ اس کو نظر انداز کر دیا جاتا، چنانچہ اسی کو دیکھ کر اس مضمون کے لکھنے کی تحریک پیدا ہوئی اور جی نہ چاہا کہ ناظرین نگار کو اس دیوان کے انتخاب سے محروم رکھوں۔

انتخاب

سرِ دیوان پر اپنے جو بسم اللہ میں لکھتا
بجائے مدِّ بسم اللہ مدِ آہ میں لکھتا

اگر میں مرتبہ حسنین کا لکھتا تو کیا لکھتا
بہ سوزِ سینۂ زہرا فقط اک آہ میں لکھتا

اہلِ ایماں سوز کو کہتے ہیں کافر ہو گیا
آہ یارب رازِ دل ان پر بھی ظاہر ہو گیا

کیا مسیحائی ہے تیرے لعل لب میں اے صنم
بات کے کہتے ہی دیکھو سوز شاعر ہو گیا

تڑپتی کیوں ہے اے بلبل کمال اتنا تو پیدا کر
کہ تیرا اشک جس جا گر پڑے گلزار ہو پیدا

مسیحائی ہے تیری تیغ میں کیا سوز کو غم ہے
جو سو سو بار ہو وے قتل سو سو بار ہو پیدا

بلبل کہیں نہ جائیو زنہار دیکھنا
اپنے ہی من میں پھول کے گلزار دیکھنا

سرا و پر شام آئی ابتلک منزل نہیں پاتا
کہاں بستر بچھاؤں یاں کسی کا دل نہیں پاتا

رسوا ہوا خراب ہوا مبتلا ہوا
وہ کونسی گھڑی تھی کہ اس سے جدا ہوا

عاشق ہوا اسیر ہوا مبتلا ہوا
کیا جانئے کہ دیکھتے ہی دل کو کیا ہوا

میں کاش اس وقت آنکھیں موند لیتا
یہ میرا دیکھنا مجھ کو بلا تھا

تجھ پہ قربان مری جان دل و دیں میرا
ایکباری تو سُن افسانۂ رنگیں میرا

ایک دل تھا جان من اس کی بساط
تو نے لوٹا سوز لوٹے ہے پڑا

تو منعِ گریہ نہ کر مجھ کو ناصحا بیدرد
نہیں ہے اب تو مرے اختیار میں رونا

تو رو نہ وصل میں لے سوز اپنے آنسو پونچھ
ابھی بہت ہے تجھے ہجر یار میں رونا

بھلا میاں سوز ہم سے راست بولو عشق خوب ہیں
بجز درد و الم پھر اور تم نے کیا مزا دیکھا

جب تک کہ میرے تن میں اے جان دم رہیگا — تیرا اسی طرح سے مجھ پر ستم رہیگا
رو دیگا عشق مجھ کو سر خاک ڈال اپنے — مرنے کا میرے تجھ کو کاہیکو غم رہیگا

ہے شوخ مزاج سوز واللہ — چھیڑیگا اسے بُرا کرے گا

بات کہتے ہی بگڑ کر تو چلا — دل تو میرا اچھینک جا، ظالم بھلا

عجب چیز تھا سوز کس سے کہیں ہم — دلے اس کو ان غافلوں نے نہ پایا
سوز تھا جو بڑا اسکتا تھا — کیوں مرے نوجوان دیکھ لیا

کیوں سوز ہماری بات مانی — آپ ہی ملا تجھ سے آن دیکھا

جس کا تو آشنا ہوا ہوگا — اس نے کیا کیا ستم سہا ہوگا
تھرتھراتا ہے ابتلک خورشید — سامنے تیرے آگیا ہوگا

مجھ کو تنہا چھوڑ کر اے شوخ بے پروا نہ جا — جان میری ساتھ جائیگی ابھی مت جا، نہ جا
شوخ ہی آئیگا خودداری بھی لازم ہے تجھے — سوز یہ کیا طور ہے اتنا بھی تو گھبرا نہ جا

جا جا، مرے پاس سے تو جا جا — توبہ، جو کہوں تجھے میں آجا

میں کہتا نہ تھا سوز تو مت ہو عاشق — یہ تیرا کیا تیرے آگے ہی آیا

خنجر سے منھ نہ موڑا، تیغے سے دم نہ مارا — اس سوز نے بھی کی ہیں تجھ سے وفائیں کیا کیا

دیکھ دل کو چھیڑ مت ظالم کہیں دُکھ جائیگا — ہاں بغیر از قطرۂ خوں اور کیا تو پائے گا
قتل کی نیت تو کر آیا ہی تو کیا دیر ہے — پر مجھے تو مار کر ظالم بہت پچھتائے گا

دنیا میں یہی دوستی ہوتی ہے مری جاں — جب تک نہ لیا دل تجھے آرام نہ آیا

کعبہ ہی کا اب قصد یہ گمراہ کریگا — جو تم سے بتاں ہو گا سو اللہ کرے گا

اے سوز عزم کوچۂ قاتل نہ کر عبث — تو ایک بھی بتا دے کہ واں جاکے آسکا

ایک دن اک شخص نے اس سے کہا — تو نے تو یہ ذکر سُنا ہوئے گا
یعنی کہ عاشق ہے تراجی سے سوز — ہو متبسم یہ کہا، ہوئے گا

ہوا دل کو میں کہتا کہتا دِوانا — پر اس بے خبر نے کہا کچھ نہ مانا
جن کو نت دیکھتے تھے اب ان کا — دیکھنا ہی خیال و خواب ہوا

سوز بیہوش ہو گیا، جب سے
تری صحبت میں باریاب ہوا

آج اس راہ دلربا گزرا
جی پہ کیا جانئے کہ کیا گزرا

آہ ظالم نے کچھ نہ مانی بات
میں تو اپنا سا جی چلا، گزرا

رات کو نیند ہے نہ دن کو چین
ایسے جینے سے اے خدا گزرا

کہتا نہ تھا میں اے دل اس کام سے تو باز آ
دیکھا مزا نہ تو نے نادان عاشقی کا

میں کس کے ہاتھ لکھ بھیجوں میاں انصاف سلام اپنا
مجھے تو بھول جاتا ہے ترے دھڑکے سے نام اپنا

مجھ سے مت جی کو لگاؤ کہ نہیں رہنے کا
میں مسافر ہوں، کوئی دن کو چلا جاؤنگا

مجھ کو دھوکا دیا کہا کہ شراب
اے، ان آنکھوں کا ہوئے خانہ خراب

کوئی دن کو چلا جاؤں گا آپ ہی
مسافر سوز کو رہنے دے یک چند

ہو گیا غم سے جان سوز گداز
پر نہ آیا تو اپنی ضد سے باز

چین کب آوے جو دیکھیں دل کی یہ بیتابیاں
نیند بھی جاتی رہی سُن سُن تری بدخوابیاں

بھلا دے عشق تیری شوکت و شان
بھائی میرے تو اُڑ گئے اوسان

تو جو کہتا ہو گلہ میرا کیا جس تس کنیں
کب کیا، کس جا کیا، کسو وقت کسدم کس کنیں

بُلبُل کدہر تو پھرتی ہے غافل خبر لے جلد
گل نے لگائی آگ ترے آشیانہ میں

ایک ڈر تھا کہ جی بچے نہ بچے
دوسرے غم نے کھائی میری جان

ظاہر میں گرچہ بیٹھا لوگوں کے درمیاں ہوں
پر یہ خبر نہیں ہے میں کون ہوں کہاں ہوں

اس پاس پھر گیا دلِ گمراہ کیا کروں
دم مارنے کی بات نہیں آہ کیا کروں

دل بیخبر پڑا ہے خدا جانے کیا ہوا
اس حال سے میں سوز کو آگاہ کیا کروں

ایک دن ایک شخص نے پوچھا
میر صاحب تمھارا یار کہاں

میں نے اس سے یہ سُن کہا بھائی
اب مجھے اس تلک ہے بار کہاں

گاہ گاہے سلام ہوتا ہے
پر وہ باتیں کہاں، وہ پیار کہاں

زندگی میں جفا غنیمت ہے
سوز یہ ظلم بار بار کہاں

بُلبُل کہیں، پتنگ کہیں اور ہم کہیں
اکٹھے یہ دل جلے نہ ہوئے ایک دم کہیں

کیا خفا کر دیا جوانی کو　　کوسوں کس منہ سے ناتوانی کو
کیوں ہیں ہم بد نظر بھلا صاحب　　آفریں تیری بدگمانی کو
سوز اب بھی رہا ہے کچھ باقی　　چھوڑ دے اب سرائے فانی کو

دو دن کی یہ زیست سوز صاحب　　جس طرح نبھے تم اب نبا ہو

جنازے والو نہ چپکے قدم بڑھائے چلو　　یہ اس کا کوچہ ہے ٹک کرتے ہائے ہائے چلو

او چلے جانے والے بے پرواہ　　کچھ فقیروں کے حال پر بھی نگاہ

غم ہے یا انتظار ہے کیا ہے　　دل جو اب بیقرار ہے کیا ہے

یہ ہو سکے کہ اپنے تئیں سوز بھول جائے　　پر میری جان کہہ تجھے کیونکر بھلا سکے

سرو قد لاکھوں بھرے ہیں مجھ کو کیا　　آہ میرا سرو بالا اور ہے

مگر جانے کا قاتل نے نرالا ڈھب نکالا ہے　　سبھوں سے پوچھتا ہے اسکو کس نے مار ڈالا ہے

آج جی اس طرح نکلتا ہے　　جس نے دیکھا سو ہاتھ ملتا ہے

دریا دلی نے مجھ کو ڈبویا　　ہے موج اپنی زنجیر اپنی

اشک خوں آنکھوں میں آکر جم گئے　　دور کے بھی دیکھنے سے ہم گئے

مثل نے ہر استخواں میں درد کی آواز ہے　　کچھ نہیں معلوم یارب سوز ہے یا ساز ہے

ایکباری دھک سے ہو کر دل کی پھر نکلی نہ سانس　　کس شکار انداز کا یہ تیر بے آواز ہے

لوگ کہتے ہیں مجھے یہ شخص عاشق ہے کہیں　　عاشقی معلوم لیکن دل تو بے آرام ہے

رونا بھی تھم گیا ترے غصہ کے خوف سے　　تھی چشم ڈبڈبائی پر آنسو نہ ڈھل سکے

سر زانو پہ ہو اس کے اور جان نکل جائے　　مرنا تو مسلم ہے ارمان نکل جائے

رامپور کی ایک خاتون سے جو نینی تال میں ہیں

رامپور سے چلتے وقت یا نینی تال پہونچکر جو خط آپ نے سب سے پہلے لکھا تھا اس کا جواب میں نے پیش کر دیا تھا، لیکن اس کے بعد آپ کے متعدد خطوط کا جواب صرف اس لئے نہ دے سکا کہ آپ کا پتہ نینی تال کا مجھے یاد نہ رہا اور آپ نے بھی پھر کسی خط میں اسکو تحریر نہ فرمایا ——— اُمید ہے اب یہ برہمی دور ہو گئی ہوگی۔

نیاز

شبِ بہار

جب رات کو ظلمت ہی ظلمت عالم پہ مسلط ہوتی ہے
جب چادرِ غفلت اوڑھے سب مخلوقِ الٰہی سوتی ہے

جب ابر اُمنڈ کر آتے ہیں اور بن کے سکوں چھا جاتے ہیں
پیمانۂ گل کو صہبائے شبنم کے لئے ترساتے ہیں

پوشیدہ نظر سے جب تاروں کی مست ادائیں ہوتی ہیں
ہوتا ہے فضا میں سناٹا، مخمور ہوائیں ہوتی ہیں

اشجارِ چمن کی شاخوں کو جب نیند کے جھونکے آتے ہیں
اور نکہتِ گل کے خُم کے خُم گلشن میں لنڈھائے جاتے ہیں

پھر پی لی ہے میں نے پیت کی مے، محسوس میں ایسا کرتا ہوں
پھر مجھکو کسی سے اُلفت ہے، محسوس میں ایسا کرتا ہوں

اختر انصاری دہلوی

نقشِ نگار

عشق کی وحشت سرا میں پہلے خود کھویا مجھے
ڈھونڈتے پھرتے ہو اب لیکر یدِ بیضا مجھے

وسعتِ ذوقِ نظر اُف رے تری معراجِ شوق
اب خدا ہونیکا خود اپنے یہ ہے دھوکا مجھے

مجھ سے یہ بیگانگی اور غیر سے یہ التفات
میری نظروں میں کیا جاتا ہے کیوں رسوا مجھے

چشمِ عالم درسِ خودداری دئے جاتی مگر
تیری نظروں نے بنایا شورشِ بے جا مجھے

عرش والوں نے مجھے سمجھا تھا خاکستر نشیں
جستجوئے یار نے دیکھا فلک پیما مجھے

مجھ پہ یہ تشہیر کی تہمت غلط یکسر غلط
تو نے یوں بیساختہ کیوں بزم میں دیکھا مجھے

جس ادا سے طور کو سرمہ کیا تھا اے نگار
وہ ادائے دلنشیں اک بار پھر دکھلا مجھے

سروپ رانی نگار

وقت کا راگ

جب سے میں نے آنکھ کھولی ہے فضائے دہر میں
ایک لافانی سفر در پیش ہے شام و سحر
جا رہا ہوں اپنے مقصودِ سفر سے بے خبر
اور بھی ہیں قافلے میری طرح گرمِ سفر
ہیں ستارے بھی رواں اپنے دیاروں کی طرف
گم شدہ ارضِ وطن کے خلد زاروں کی طرف
اور انساں بھی ہیں ذوقِ جستجو سے بیقرار
تھک کے گورستے میں گہری نیند سو جاتے ہیں یہ
موت کے خاموش ویرانے میں کھو جاتے ہیں یہ

آہ انساں یہ سمجھتے ہیں کہ سب کچھ وقت ہے
اور مری تابِ سفر ہے اُن کے دم سے برقرار
(گو مرے دامن پہ آسودہ ہے صدیوں کا غبار)
ہے اُمیدوں کے اُفق پر دائمی طلعت کا نور
موت کے جھونکوں سے بجھ جاتے ہیں روحوں کے شرار
پھر مگر ہوتے ہیں شعلے زندگی کے آشکار

ہو اگر مجھ کو نہ انسانوں کی ہمراہی نصیب
دلشکن مایوسیوں سے مضمحل ہو جاؤں میں
بیدلی کے کیفِ مرگ آموز میں کھو جاؤں میں
اور مِل جائے مری ہستی سراسر خاک میں
بزمِ ہستی میں حوادث کا گزر کوئی نہ ہو
زندگی کوئی نہ ہو شام و سحر کوئی نہ ہو

عدم